تجدید عمل

سوسائٹی کا ایک جدید نظام

مرزا عسکری علی خاں مجازی

بہ اہتمام

انٹی ریلیجس سوسائٹی (لاہور)

فروری ۱۹۳۳ء

بار اوّل

قیمت [illegible]

کتابت کی بعض اہم اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸	۸	بعض	اکثر
۱۲	۶	افشاں	افشا
۱۵	۱۲	ل سکتا	نہیں رہ سکتا
۵۶	۹	کروڑوں	لاکھوں

صفحہ ۴۸ کا نوٹ صفحہ ۵۴ پر ہونا چاہیے۔

انگریزی کے بعض مترادف الفاظ

شعور	Conciousness
غیر شعوری	Unconciousness
مابعد الطبیعات	Metaphysics
نفسیات یا علم النفس	Psychology
متشکک، لاادریہ	Sceptic
جماعت	Crowd
تناسخ	Transmigration of Soul

Not a Guide is visible even when you
search for him,'

as simply and nakedly as they come to him. Such a quality must appeal and endear him to the finer spirits among his readers. But, what convinces me, most of all, that his poetic inspiration is genuine, a sense of humour that peeps out again and again in the midst of his seriovsness, e. g.,

'The pain is a thousand times preferable to its medicine.'..."

—Prof. R. R. Sreshta, M. A. (Cantab).

MEHSHER-I-KHAYAL

Sheikh Mubarak Ali, Book Seller, Lahore.

URDU (*Aurangabad, Deccan*) :— "Yeh kitab Majazi saheb ki Urdu nazmon ka ek mukhtasar majmua hai, jinmen unhun ne apne hakimana khayalat ka izhar kiya hai ... Agarche chand hi nazmen hain magar khub hain, khayalat ke aitebar se bhi aur tarze ade ke lihaz se bhi." Price 3 As.

PRINTED AT THE AZIZ PRINTING PRESS, FLEMING ROAD, LAHORE

ان چند اوراق کی صورت میں یہ ایک تحفۂ اخلاص ہے، جسے مصنف اپنے زمانہ کے آگے پیش کرتا ہے۔ اور اپنی اس خدمت پر فخر کرتا ہے کہ اُس نے ہندوستان کو ایک ایسا مشورہ دیا ہے۔ جس کی اُسے ضرورت تھی!

مجازی

(مصنف پیام جاوید وغیرہ)

۱۹۳۳ء

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر

اس کتاب میں مقدس ناموں کا اظہار نہایت سادگی کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن اس طرز عمل سے ان کی اہانت منظور نہیں ہے۔ بلکہ ادبی خصوصیات کی پاسداری ملحوظ ہے۔

مصنف اپنے تمام روشن خیال ناظرین سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس کتاب پر ریویو کریں۔ خواہ ان کی تنقید مصنف کی مخالفت ہی میں کیوں نہ ہو — مگر اسے بھی قدر کے ساتھ آنکھوں میں جگہ دی جائے گی! — ان تبصروں کو مصنف تک پہنچانے کی بھی کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ اسے اخبار بینی کا زیادہ اتفاق نہیں ہوتا۔

فہرست مضامین کتاب کے خاتمہ پر ملاحظہ ہو۔

انٹی ریلیجس سوسائٹی
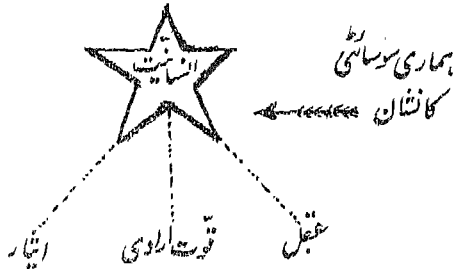
دورِ حاضرہ کو اربابِ عقل کی ایک ایسی جماعت کی احتیاج ہے، جو خود کورانہ تقلید سے آزاد ہو اور دوسروں میں بھی یہ اسپرٹ پیدا کر سکے!

مقاصد — (۱) ذہن کو توہمات کی تاریکی سے نکال کر روشن و بینا بنانا (۲) منطقی و محقق بنانا (۳) اور ہماری سوشل زندگی میں ہمہ رنگی پیدا کرنا — اس سوسائٹی کی استفادہ بینا شرائط — اس انجمن کے ممبر ہر فرقہ، طبقہ اور مذہب کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ البتہ ان کا شخص حتی الامکان جاہلانہ رسوم و قیود کی کورانہ اطاعت سے تحقیق و تفتیش ہونا چاہیئے۔

اس سوسائٹی کی ضروریات کی ترجمانی ایک سالانہ جلسہ کریگا جس میں شرکت کی تمام ممبروں سے بذریعہ اشتہار درخواست کیجائیگی۔ ہمارے ممبروں کو چاہیئے کہ ایک کارڈ کے ذریعہ اپنے نام اور مفصل پتوں سے وہ ہمیں مطلع فرمائیں۔

یہ آپ کی سوسائٹی ہے۔ اسے مٹانا اور فروغ دینا دونوں باتیں آپ ہی کے اختیار میں ہیں — اگر کسی کو نظر کو آفتاب کی پہلی کرن کو دکھا دی جائے تو

وہ یہ گمان بھی نہیں کر سکتا۔ کہ یہی ضعیف شعاع آہستہ آہستہ تمام کائنات کو جگمگا دے گی۔ اسی طرح ہماری سوسائٹی بھی ایک دن تمام ہندوستان کا دستور العمل بنے گی ــــ پنجاب جس میں زندگی کے آثار اکثر صوبہ جات ہند سے زائد پائے جاتے ہیں، اور جو آج دیگر معاملات میں تمام اقلیم ہند کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ہماری سوسائٹی کا بھی پاسبان بن گیا ہے!

نوٹ:۔ خط و کتابت میکلوڈ روڈ لاہور کے پتہ سے کی جائے۔

خادم
مجازی (ریذیڈنٹ)

تعارف

"یہ مقالہ انگریزی زبان میں مسٹر ایم۔ آئی مرزا بی۔ اے (آنرز) نے عرصہ ہُوا،
لکھا تھا میں اس کا اردو میں ترجمہ کرکے ناظرین کو پیش کرتا ہوں"
سید طالب حسین آرزو بخاری (منشی فاضل)

(۱)

مرزا عسکری علیخاں کی ولادت ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ آپ نے اپنا تخلص مجازی اختیار کیا جس سے آپ کے فلسفۂ زندگی کا خصوصی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

(۲)

آپ کے خاندانی حالات کے متعلق اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ آپ نوابان اودھ کے خاندان سے ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ مرزا محمد عباس علیخاں سب سے پہلے ہندوستانی ڈپٹی کمشنر ہیں اور انہیں حکومت برطانیہ نے ایک بالکل نیا اور موروثی "مرزا بہادر"[1] کا خطاب دیا تھا!

---

[1] یہ بالکل جدید اور موروثی خطاب سب سے پہلے میرے پردادا آغا علیخاں عزت آغائی صاحب ــــ (جو عہد واجد علیشاہ میں سلطانپور کے ناظم تھے) کو حکومت برطانیہ کیطرف سے عطا ہوا تھا۔ پھر جد امجد مرزا محمد عباس علیخاں مرحوم کے ورثہ میں آیا اور آج اس معزز خطاب کا مالک میرا ایک محترم عزیز ہیں
مجازی

(۱۳)

ایک تی سنبس ([illegible]) اپنے خاندان اور جاستے پیدائش کے فخر سے مستغنی ہوتا ہے۔ آپ محض اپنی علمیت اور خداداد ذہانت کی وجہ سے ایک نہایت اعلیٰ درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ آپ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ نہایت آزاد خیال ہیں اور آزادی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت نہایت رواں ہوتی ہے اور آپ ہر شے کا تحقیقی نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا طرز تحریر نہایت سادہ اور دلنشین ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنے دماغ کی طرح اپنی ذات کو بھی مقامی تاثرات سے بچائے رکھا ہے۔ اسلئے وہ لفاظی اور الفاظ کی شان و شوکت جو وہاں کے مصنفین کا مابہ الامتیاز ہے۔ آپ کی تحریر میں نہیں پائی جاتی چونکہ آپ اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلئے آپ کا طرز تحریر نظم و نثر دونو میں یکساں ہوتا ہے۔ آپ کی نظم و نثر کے گہرے مطالعہ سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

(۱۴)

اگر یہ صحیح ہے کہ مشرق اور مغرب کی دنیا کل مختلف تہذیبیں ہیں۔ تو یہ ماننا پڑیگا کہ وہاں کے لوگوں کا طرز تخیل بھی الگ الگ ہے اور چونکہ لٹریچر کا لوگوں کی ذہنی کیفیات پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حجازی کو ایک سادہ مشرقی ہونا چاہئے تھا۔ باوجود اس امر کہ وہ کبھی یورپ نہیں گئے۔ اور نہ متداول مغربی تعلیم کی تکمیل کی ہے۔ پھر بھی آپ میں مشرقیت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔
آپ ہمیشہ اپنی تحریر کی بنیاد ایسے فلسفی اور مذہبی مباحث پر رکھتے ہیں جن

"کوئی شخص مجازی کے فلسفۂ زندگی سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ لیکن کوئی
ذہین اور ایماندار ناظر شاعر کی رفعتِ ذہنی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا
اس مجموعۂ انتخاب کی ایک ایک سطر اور ایک ایک مصرع اس واقعہ کی شہادت دے رہا ہے
کہ اس کا مصنف کشمکشِ خیال میں مبتلا رہا ہے۔ اور اس نے جو کچھ لکھا ہے بےچینی کے عالم میں
لکھا ہے کیونکہ اسکے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہے۔ شاعر ہونا دشوار ہے
اور متکلم ہونا دشوار تر۔ اور شاعر و متکلم کے دوگونہ اوصاف کا ایک ذات میں جمع ہو جانا
تقریباً محال ہے جیسا کہ حالی کا حشر ہوا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مجازی اس ناممکن الوجود
زمرے میں ارادتاً شریک ہونا نہیں چاہتے۔ اگرچہ بعض اوقات اُن کے ہاں یہ شان پائی
جاتی ہے۔ لیکن انہیں آورد سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں، عالمِ محویت
میں کہتے ہیں۔ مجازی ہندِ جدید کی ایک نادر الوجود ہستی ہیں۔ ایک آزاد خیال مسلمان جو
آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں اور جنکے قلم سے وہی بات نکلتی ہے جسے وہ صحیح مانتے ہیں
انکے جذبۂ حق یا حقیقت کی طلب نے انہیں کرشن اور علی، ہیوم اور خیام کا یکساں
طور پر ثناخواں بنا دیا ہے۔ بہت سی خرافات ہیں جو اردو شاعری کا قالب اختیار
کئے ہوئے ہیں۔ یعنی رنگینیاں، خوشگوار نغمے، لغو اور مخربِ اخلاق غزلیں
اور دورِ حاضرہ کے نوے فیصدی اردو شعراء ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو وہ حقیقت
میں شاعر ہوتے ہیں۔ اور نہ اُنکے شعروں میں کوئی اصلیت ہوتی ہے۔ مگر میں مجازی کی
اس لئے قدر کرتا ہوں کہ ان میں خاص طور پر یہ قیمتی صفت موجود ہے۔ ذہنی اور ادبی بلند پروازی۔"

یہ الفاظ محض آپ کی تصنیف ہی پر روشنی نہیں ڈالتے۔ بلکہ انسے آپکے شخصی خصوصیات بھی نمایاں ہو جاتے
ہیں مگر تنقیدی نظر رکھنے والے ناظرین خود ہی ان باتوں کا اندازہ کر لینگے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ
کسی مصنف کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار شہرت پر ہوتا ہے اور اکثر مصنفین اس قسم کے مستقبل کا انتظار کرنا
پڑا تو یہ بہت ممکن ہے کہ ہمارے نوجوان فلسفی کو بھی اپنی کامیابی کیلئے کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے!

کیفِ الہامی

آہ! میرے زرّیں خیالات، جو بادلوں کی طرح میرے دماغ میں ہجوم لگائے رہتے ہیں، مگر شاداب زمین انہیں نہیں ملتی، کہ وہ برسیں، پھول کھلائیں اور پھل پیدا کریں! ریتلی زمین میں بھلا بارش کا کیا فائدہ! وہ دماغ ہی میں ہجوم کئے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ناموافق آندھیوں کے جھونکے آتے ہیں اور انہیں اڑا لے جاتے ہیں!

میرے خیالات کے بادل اس وقت بھی میرے دماغ میں ہجوم لگائے ہوئے ہیں۔ برسنا چاہتے ہیں، مگر میں اُن سے کہتا ہوں وہ نہ برسیں، میں خود اُن سے درخواست کرتا ہوں، کہ وہ نہ برسیں، اور ناموافق آندھیوں کے سہارے مجھے بھی اپنے ساتھ اڑا لیجائیں! وہ مجھے بھی اپنے ساتھ اُس کوہ کی وادی میں لے جائیں۔ جہاں نطشے اور لیبان کی روحیں گشت لگاتی ہیں۔ اس وادی میں مقدس روحوں کا گذر نہیں، وہاں خیام اور ہیوم کی روحیں بھی نہیں جا سکتیں، پھر مقدس روحوں کا کہاں ٹھکانا!

وہ ایک ایسی وادی ہے، جہاں پہنچکر خیال کی بے اعتدالیوں (تخیل آرائی) کے بادل چھنٹ جاتے ہیں اور مکدر فضا (شکوک) صاف ہو جاتی ہے، ایک طرف شفاف پانی کا ایک چشمہ (عمل) رواں ہے جس میں سے نغمہ کی یہ صدا آ رہی ہے ؎

خوشی عیش ہے، عیش دورِ آسماں کیلئے

نہیں ہے فکر کی حاجت، غمِ جہاں کیلئے

تو چشمِ عقل سے فطرت میں ڈھونڈھ اپنا مقام

کہ علم کا وہ خزانہ ہے جسم و جاں کیلئے

تو موج و سیل میں رہ، جنگِ مستقل بن کر

کہ وہ سکون کی منزل ہے کارواں کیلئے

ترے عمل میں نہاں رازِ زندگانی ہے!

یہ موت [1]، موت نہیں عمرِ جاودانی ہے

(مجازی)

---

[1] انسان فانی ہو، مگر حیاتِ انسانی کو فنا نہیں۔ ہمارے "عمل" کے موثرات بعدِ مرگ بھی دنیا میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں!

تہدیہ

عقل کے نام

ذہن کی وہ شریف ترین خصوصیت، جس کا وجود ایک ذی روح حیوان
کو انسان بناتا ہے، اور جو تمام گنجینۂ حقائق کی کلید ہو!

ایثار کے نام

فطرتِ انسانی کا وہ پاک جوہر، جو دیوتا کو حیوان سے ممتاز بناتا ہے، اور
جو تمام انقلاباتِ عالم کی روح ہے!

قوتِ ارادی کے نام

فطرتِ انسانی کی وہ مقدس روح، جس نے صحراؤں اور سمندروں کو مسخر کر لیا
ہے، اور جو تمام کامیابیوں کی جان ہے!

مجازؔ
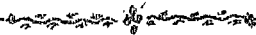
مقدمہ

میرے روشن خیال ناظرین جنہیں میری قدیم تصنیف "پیام جاوید" کے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ وہ اس جدید تصنیف "تجدید عمل" میں مجھے ایک دوسرا آدمی پائینگے! اس لئے کہ اس کتاب میں اپنے اکثر خیالات قدیم سے میں نے اختلاف کیا ہے۔

بات یہ ہے۔ کہ چند سال کے خاموش مشاہدہ نے مجھ پر یہ راز افشاں کر دیا۔ کہ دنیا کو بجائے خشک خیالات کے عمل کی زیادہ ضرورت ہے! چنانچہ ایک حقیقت کے جویا کا یہ فرض ہونا چاہئے۔ کہ وہ اپنے خیالات کو ہر لمحہ نقد و تبصرہ کی ترازو میں تولتا رہے، اور ہر وقت اپنی غلطی تسلیم کر لینے پر مستعد رہے! لیکن اسکا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں۔ کہ میرے پرانے خیالات عبث تھے! بلکہ اصل یہ ہے۔ کہ "پیام جاوید" دماغ کی ریاضت کا ایک نا چیز مشورہ تھا۔ اور "تجدید عمل" عملی زندگی کی خاطر ایک پر خلوص تحفہ ہے! اور چنانچہ اس کتاب میں میں نے تمام تر "جماعت" کی زندگی سے بحث کی ہے، اسلئے کہ انسان تمدن و معاشرت کا ایک کیڑا ہے۔ اور اسی بنا پر اس کی زندگی کو ہمیشہ معاشرتی حثیت سے پرکھنا چاہئے!

چنانچہ اب میرا یہ مستقل خیال ہو گیا ہے۔ کہ جو نظریہ "عملی" حیثیت سے پورا نہ اترے۔ اس کی قدر و قیمت بجز فنون لطیفہ کے اور کچھ نہیں۔ اور ہر شے کی قیمت کا اندازہ عملی نقطۂ نظر سے لگانا چاہئے۔ حتیٰ کہ علوم مابعد الطبیعات

بھی کچھ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں!

بات یہ ہے کہ ذہن انسانی اگرچہ تخیل کی پرواز میں انفرادی اخلاق کے معیار کو بہت اہمیت دیتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ فلسفیانہ حیثیت سے اخلاق کا کوئی اصلی معیار نہیں بن سکتا۔ اسلئے کہ جن چیزوں پر ہمارے عمل کا انحصار ہوتا ہے وہ خود مبہم ظنیات ..... سے زائد حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور اس معاملہ میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ وہ چیزیں جو ہمارے دلوں کو لبھا لینے والی ہوتی ہیں مثلاً رحم اور ایثار وغیرہ، انہیں خواہ شخصی حیثیت سے ایک آئیڈیل کا لقب دے دیا جائے مگر اجتماعی اور معاشرتی حیثیت سے اُن کا ہر موقع پر قابلِ عمل ثابت ہونا ضروری نہیں ہے!

اس لئے میرے خیال میں عملی حیثیت ہر معاملہ میں پیش نظر رکھنی چاہئے ... (جیسا کہ مذکورہ بالا ہے) اور پھر مذہب جسکی تعریف میرے خیال میں بجز اسکے اور کیا ہوسکتی ہے، کہ وہ چند اصول و خیالات کا ایک مجموعہ ہے جو عملی تنظیم کی خاطر، ایک غیر شعوری لباس میں عوام الناس کو پیش کیا جاتا ہے! اسے تو خاص طور پر نہایت سختی کے ساتھ اس معیار پر جانچنا چاہئے!

اور ہمارا یہ طرزِ عمل، اگرچہ دیرینہ مذاہب کی بعض باتوں کو بادی النظر میں اب بھی قابلِ اعتماد سمجھے گا، مگر بات یہ ہے کہ انسانی زندگی زمانہ کے ساتھ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اسلئے ہمارا وہ جادۂ عمل (مذہب) جو پرانی زندگیوں کے لئے بنایا گیا تھا، آج بھلا کیوں کر قابلِ عمل ثابت ہوسکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ مذہب قومیت کو بدل نہیں سکتا، بلکہ خود قومیت مذہب کو اپنے قالب میں ڈھال لیتی ہے، پھر بھی اگر کسی مذہب کی روح مردہ ہے، تو قومیت ایک حد تک زخمی ضرور ہو جاتی ہے، جس کا علاج فوراً انسان

نہیں ہوتا۔ اور اسی لحاظ سے میں مذاہب متداولہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہا ہوں!
اگرچہ میرے خیال میں مذہب خود توہمیت کا ایک پرانا تخیل ہے جسکی تعمیر ایام جہالت میں ہوئی تھی، اس لئے وہ آج ہمارے کام کا نہیں رہا، دوسرے ہم اس تاریخی حیثیت سے بھی انکار نہیں کر سکتے، کہ جب کسی تمدن کے اجزاء اساسی کمزور اور مردہ ہو گئے ہیں، تو پھر اُن ہی اساس کی ترویج کی دوبارہ کوشش بالکل عبث ثابت ہوئی ہے، اور اس کا نتیجہ لیسا اوقات پہلے سے زیادہ خراب نکلا ہے اس لئے اب ہمارے پاس بجز اس کے اور کیا چارہ ہے، کہ ہم دیرینہ تمدن کو بھی جدید سانچے پر بدل دیں —— اسلئے کہ اب وہ دیرینہ مذہبی اجزاء واقعی طور پر ہمارے دور میں مضرت رساں بن گئے ہیں! میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ لوگ یہ دعوی کیونکر کر بیٹھتے ہیں کہ مثلاً "خدا" کا عقیدہ بہت سے گناہوں کا پشت پناہ ہے! بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں، کہ اس خیال نے ہمارے ذہن کے فطری ارتقاء کو صدمہ پہنچا دیا ہے، اور بجائے خود اعتمادی کے انسان بے بس اور مجبور بن گیا ہے! البتہ اگر مذہبی اصطلاح میں ذہنی ارتقاء کا نام گناہ رکھا گیا ہو، تو یہ اور بات ہے!
میں اپنے ناظرین کو یقین دلاتا ہوں، کہ دنیا کے متعلق وہ جتنے بھی پرانے تخیلات چلے آتے ہیں، جن کے ذریعہ سے الوہیت فقر و استغنیٰ اور ترک علائق وغیرہ کی تلقین دی جاتی ہے، غلط ہیں! اور زندگی کے لئے مہلک اور ناقابل تقلید۔ اچھا عجیب لطیفہ یہ ہے، کہ بدھ مت جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دیگر مذاہب قدیمہ سے بالکل الگ ہے، اور جو توہمات کی اشاعت نہیں کرتا، اس میں تو یہ شانِ الٰہیہ اور بھی شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے، جو اجتماعی حیثیت سے یقیناً خطرناک ہے!
چنانچہ بانیانِ مذاہب کا پہلا فرض، اپنی قوم میں بجائے خالص علم کے احساس

"عمل" پیدا کرنا ہے، اور یہی روح ہم اپنے ملک کے مذاہب میں بالکل نہیں پاتے
اس خصوصیت میں ایک ہندوستان ہی ایسا ملک ہے، جس میں دس ہزار برس قبل کا
تمدن آج بھی اسی پرانی وضع میں چلا آرہا ہے!

اگرچہ اس راز کا صحیح طور پر انکشاف بہت دشوار ہے، تاہم جو کچھ ظاہری اسباب
ہمیں ملتے ہیں، انہیں اجمالی حیثیت سے اس کتاب میں قلمبند کر دیا گیا ہے۔ جنھیں
دہرانا طوالت کا باعث ہوگا، مختصر طور پر بس اتنا کہہ دینا کافی نظر آتا ہے، کہ
بیرونی اقوام کے متواتر حملوں نے غیر ملک میں ان کے قیام نے ہندوستان
کو ایک ہی تمدن و معاشرت کے زیر سایہ استقلال کے ساتھ اتنے عرصہ تک نہیں
رہنے دیا، کہ اس کا نشو و نما پختہ ہو کر نئے برگ و بار پیدا کرتا، اور پھر ضروریات
قومی آہستہ آہستہ اسے بدل دیتے ـــــ لیکن یہاں تو غیر اقوام اپنے ساتھ جو تمدن
و معاشرت لائے رہے، ان میں ہمیشہ باہمی تصادم ہوتا رہا۔

بات یہ ہے، کہ جب تک کسی جماعت کا ایک لباس، ایک زبان اور ایک مذہب
نہ ہو، وہ قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہے، اور اس کے لیے تمام افراد قومی کا متحد
الخیال اور متحد الاحساسات ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ بات ہندوستان کو کب نصیب
ہوئی۔

چنانچہ حیات شخصی کا ارتقاء تمامتر حیات قومی کے ارتقا پر منحصر ہے، اور جماعت
کی زندگی کو سکون مل سکتا۔ تاوقتیکہ انہیں قومیت کی روح پیدا نہ ہو جائے اسلئے اگر
کوئی صحیح مذہب آج (خصوصاً اہل ہند کیلئے) ہو سکتا ہے تو وہ قومیت ہی ہونی چاہیے

له البتہ ہند قدیم کو یہ بات ایک عرصہ کیلئے حاصل ہوگئی تھی، اور اسی دور کی پیداوار کو آج
تمدن ہند کے نام سے پکارا جاتا ہے ۱۲

اور افراد قومی کی مسرت مفاد قومی کے ساتھ وابستہ ہونی چاہئے! جو خیال کہ بادی النظر میں تنگ نظری کے مترادف ہے مگر ہمیں اپنی زندگی میں بہت سے ایسے معاملات سے سابقہ پڑتا ہے جن کا باطن ظاہر سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور جس کا فیصلہ تجربہ ہی پر منحصر ہے! چنانچہ یہ آئیڈیل بھی اُن ہی میں سے ایک ہے!

لیکن ظاہر ہے کہ کسی جدید خیال کی اشاعت کیلئے زبردست ایثار اور غیر معمولی قوت ارادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو آج ہمارے خیال میں ہندوستان میں فقط "گاندھی" کو نصیب ہے۔

یہ کام قوم کے مصنفین اور اربابِ قلم کے ذریعہ سے بھی انجام پا سکتا ہے مگر ہمارے ملک میں تقریباً یہ صفحہ سادہ پڑا ہوا ہے۔ ایک سچا شاعر اور ادیب ایک خاص قسم کی روح ہوتا ہے۔ جسے اپنی روح کو قوم کے قالب میں ڈال دینے کی قدرت ہوتی ہے مگر ہمارے یہاں اس قسم کی روحیں کہاں ہیں؟ جو ہمارے معیار پر پوری اتر سکیں۔ اور آج کوئی ایسا صاحبِ قلم نہیں، جو قومی روح کو جگا سکے یا صحیح معنوں میں قومیت کے ساز کو چھیڑ دے! اور مروجہ تو ہمات (مذاہب) سے دست بردار ہو کر مظاہر فطرت کو اپنا جاذبِ عمل بنائے اور اس طرح بلندئ فطرت کا ثبوت دے! جس کیلئے اعلیٰ جرأت درکار ہے۔ مگر افسوس! آج ہمارے سینے اس قسم کی جرأت سے خالی ہیں!

مجازی

لاہور
ستمبر ۱۹۲۳ء

اس بحث پر زیادہ غور و خوض کرنے سے ذہنیت عوام کی جو نمایاں خصوصیت میری سمجھ میں آئی ہے۔ وہ اُنکے دماغ سے پرواز خیال کا معدوم ہونا ہے، یعنی عوام النّاس کے خیالات رفعت پرواز سے قطعی عاجز ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر رسم و رواج، ملکی حوادث، اور مذہبی اوہام وغیرہ بھی اُن کی ذہنیت پر ایسا ہجوم کر لیتے ہیں۔ کہ وہ اپنی ذہنی پرواز کو اُن کے ماورا نہیں لیجا سکتے! اور یہ ظاہر ہے۔ کہ جب کسی دماغ میں رفعتِ پرواز کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے۔ تو اپنے ماحول کی ادنیٰ سے ادنیٰ شے بھی اُسے متاثر کرنے کیلئے کافی ہوتی ہے، اور اب اُس کی ذہنیت کیا ہوتی ہے؟ گویا ایک ایسی کتاب ہوتی ہے، جس میں چند وقتی تجاریب علت و معلول کے ناقص نتائج کے ساتھ، اور چند حوادث تحیّر و استعجاب کو لئے ہوئے

اور بعض اوہام و رسوم حقیقت اور اصلیت کے عنوان میں مندرج ہوں۔ عوام الناس
کی ذہنی کمزوری اپنے ساتھ بعض بدترین نتائج اور بھی لاتی ہے، اور وہ کیا ہیں؟ عملی
نقائص! اور یہ ظاہر ہے کہ جب علم غلط ہے تو عمل کا بھی ناقص ہونا امر لازم قرار
پاتا ہے۔ چنانچہ ہم اگر اُن کے عمل کا نقشہ کھینچیں، تو اس کی شان کیا ہوگی؟ بعض
ایسی خود غرضیاں جو اپنے ہی لئے مضرت رساں ہوں، چند ایسے فریب جن کا کفارہ
اپنی ہی ذات کو بھگتنا پڑے، بعض ایسی نیکیاں جو خویش و اغیار دونوں کے حق میں مصیبت
کا پیام ہوں، اور چند ایسے اُلٹے ہوئے جذبے جو عقل کا خون کرنے والے ہوں، نظر
آئیں گے۔ یہ تھی نفسیات عوام کی مختصر سرگزشت! اب ہم اپنی تمہید کو ذرا تفصیل کے
ساتھ بیان کرتے ہیں!۔

عوام الناس کے قوائے عقلی۔

عقل عوام کی مختصر تعریف یہ ہے کہ صحیح استدلال کے قبول کرنے کی اُن میں
صلاحیت مطلقاً نہیں ہوتی۔ البتہ وہ جس قسم کے استدلال سے متاثر ہوتے ہیں وہ
حقیقتاً چند مغالطے ہوتے ہیں، جو صحیح کا رنگ چڑھا کر اُن کے سامنے پیش کئے
جاتے ہیں اور ایسے مغالطوں میں بھی وہ مغالطے اُنہیں زیادہ اپنی جانب کھینچنے
میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں، جو ان کے ذاتی تجربوں اور واقعات میں بھی عملی
جامہ پہن چکے ہوں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض استدلال عوام کو اپنی طرف
متوجہ کرلیں مگر ان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب تک اُن کی ذہنی ساخت
کے مطابق اُتر نہ لیں، اس وقت تک وہ اُن کی نظر میں مان لئے جانے کے قابل
نہیں ہوتے، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض عقلی استدلال کو عوام الناس
اپنے مطابق صورت بدل لیتے ہیں۔ یا دہرا فرضی اور جھوٹے فسانے اُن کے
حافظہ کے نقوش و نگار ہوتے ہیں۔ اور وہ مجموعہ واقعات جن کا حقیقت سے کوئی

تعلق نہیں ہوتا، عوام کو اپنی جانب کھینچنے میں کمال دسترس رکھتے ہیں۔

عوام الناس کے افعال و اعمال۔

اس مقام پر ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ عوام میں عملی مادہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کا باعث یہی ہے۔ کہ اُن کی قوتِ فکری کی کمی انہیں عمل کے گہرے نتائج پر پہنچنے کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی اشئے انہیں عمل کے میدان میں سرگرم ہونے کیلئے مستعد کردیتی ہے۔ اس امتیازی خصوصیت کو اگر پیش نظر رکھکر عوام و خواص کے افعال کا موازنہ کیا جائے تو میرے خیال میں عوام الناس کے افعال شمار میں زیادہ نکلیں گے۔ مگر بے ربط، سادگی آمیز اور بے مصرف بھی ٹھہریں گے، ان میں استحکام بھی کم پایا جائیگا۔ اور اُن میں سے اکثر اعمال ایسے نکلیں گے جن میں بجائے کسی فرد کے ارادہ کے ایک جماعت کے ارادوں کی شرکت پائی جائے گی، اور اُس کی وجہ کیا ہے؟ وہی عوام الناس کی تقلید پرستی، اعتقادوں کا ذہن میں ہجوم وغیرہ وغیرہ۔

افعال عوام اور افعال حیوانات۔

عوام کے افعال حیوانات کے افعال سے اگرچہ ظاہری اور تمثیلی حیثیتوں میں قطعی مختلف ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے افعال کا محرک بجائے دماغ کے دل ہوتا ہے اور بجائے عقل کے جذبات و رجحانات! بس فرق اسی قدر ہے کہ حیوانات کے افعال فطری اور نیچرل ہوتے ہیں، درانحالیکہ ثانی الذکر صنف کے افعال غیر فطری اور مصنوعی ہیں۔ مگر باطنی حیثیت سے دونوں کی کیفیت ایک ہوتی ہے، اس لئے کہ حیوانات کے افعال کے محرک اُن کے فطری رجحانات ہوتے ہیں اور عوام کے حرکات کے محرک وہ رسوم و قیود اور تمدنی اجزا ہوتے ہیں، جو اعاظم رجال کے دماغ کی پیداوار

ہوتے ہیں۔ غرضکہ اس حیثیت سے عوام و حیوانات دونوں یکساں ہیں کہ جو کام حیوانات کے ساتھ اُن کی فطرت کرتی ہے، وہی کام عوام کے ساتھ مقامی تمدن اور رسوم و قیود کرتے ہیں! یا اس امر کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ اگر حیوانات کی رہنمائی نیچر کے ہاتھ سے ہوتی ہے تو عوام کی رہبری اُنکا ماحول کرتا ہے!
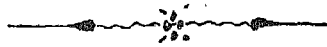
باب دوم

پہلی فصل

مذہب کے نفسیاتی اجزاء

مکڑی اپنے رہنے کے لئے جالا تنتی ہے، اسی طرح تمام حیوانات اپنی خلقت کے مطابق اپنے رہنے سہنے کی خاطر مختلف قسم کے گھونسلے اور بھٹ وغیرہ بناتے ہیں!

چنانچہ انسان، جو ذی شعور ہونے کی بنا پر دوسرے حیوانوں سے ممتاز ہے۔ اسلئے اُس کا رحجانِ فطری بھی دیگر حیوانات سے مختلف حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی زندگی تمام تر فطرت کے ہاتھ میں نہیں رہی بلکہ بڑی حد تک اپنے ہاتھ میں آگئی ہے!

پھر انسان مدنی مخلوق ہے، اس لئے کہ جب وہ اپنی حیاتی ذمہ داریاں

اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے تو پھر اُس کے ضروریات بھی مصنوعی ہو جاتے ہیں، اور اس وجہ سے اُن میں اضافہ ہو جاتا ہے! چنانچہ دورِ وحشت سے نکل کر جب انسان نے تمدن میں قدم رکھا تو اُس کے ضروریات میں اضافہ ہو گیا اور اس لیئے اُسے سوسائٹی کی احتیاج پڑی، کیونکہ ہر شخص اپنے تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیئے تنہا ناکافی تھا اس لیئے تمام افراد کو متحد ہو کر کام کرنا پڑا اور "تقسیم عمل" کا رواج پڑا!

یہ داستان تو تھی عملی زندگی کی، لیکن پھر اس عمل کے لیئے کچھ مواد (دستور العمل) بھی ضروری تھا، اور یہ مواد بھی اُس دورِ تمدن کی ہنگامی اور مقامی پیداوار تھا۔ انسان نے اس مواد سے استفادہ کیا۔ اور ایک خاص "نظام تخیل" قائم کیا جو عمل میں آکر "نظام اخلاق" کہلایا اور اُسی کو زمانہ گزرنے کے بعد کسی قدر منضبط صورت میں "مذہب" کہنے لگے! اور چونکہ ہر زمانہ کی اخلاقی (نفسیاتی) روح ہنگامی و مقامی موثرات کے تحت میں بدلتی رہتی ہے، یہی وجہ تھی کہ ہر زمانہ کے مذہبی اجزا بھی بدلتے گئے اور قومی و ملکی خصوصیات کے ساتھ اُن کے نام بھی مختلف ہوتے گئے اور شکلیں بھی تبدیل ہوتی رہیں۔

چنانچہ ہماری سوشل زندگی کی نشو و نما ابھی تک مذہب ہی کے سایہ میں ہوتی رہی ہے۔ جو اگرچہ اس دور میں ایک غیر شعوری نظام اخلاق نظر آنے لگا ہے، مگر یہی غیر شعوری روح ہمارے محترم اسلاف کی پاسبان رہی ہے اور ہمارے تمدن کی یہ تمام ارتقا اسی تاریک دنیا میں ظہور پذیر ہوئی ہے اور اسکے موثرات اگرچہ آج "قانون" اور "نظام حکومت" کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ مگر جس طرح ایک ہی قانون ایک ہی وقت میں دو مختلف ممالک کیلئے موزوں نہیں۔ بعینہ مذہب بھی

جو ایک ذہنی و ضمیری قانون ہے، اور جس کا مفادِ "جماعت" کے لئے بسا اوقات عملی و ملکی قانون سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا ہے، بھلا کیونکر اپنی پرانی حالت میں مفاد بخش ثابت ہو سکتا تھا؟ — جو حقیقتاً قوانینِ عدالت کی طرح اپنے ہی وقت اور مقام کے ضروریات کا ترجمان ہے!

(۳)

غرضکہ ضروریات اور امزجہ کے اختلاف کی بنا پر جس طرح ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے ایک ہی قسم کا قانون کارگر نہیں ہو سکتا، اُسی طرح ایک ہی مذہب بھی، ہر زمانہ یا ہر قوم کے لئے "مفاد بخش" ثابت نہیں ہو سکتا! اور اس میں ہر لحظہ تغیر کی ضرورت ہے!

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایک ہی قوم میں مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب کا دور دورہ رہا ہے، جو گویا اس زمانہ کے مزاجِ عقلی[1] کے ترجمان تھے اور قومی نفسیات کے پرتو! اور ان ادوار سے ہر قوم کے لئے گذرنا ناگزیر ہے!

مثال کے طور پر ہندوستان کو لو، جو اپنے تمدن کے لحاظ سے دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ہے، اور اس لئے اُسے مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب سے سابقہ پڑا ہے۔

ہمیں تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب ہندوستان کا دورِ وحشت ختم ہوا ہے اور تمدن کا سنگِ بنیاد رکھا گیا ہے، تو اس وقت کی انسانی ذہنیت کیا تھی؟ انسان

---

[1] ظاہر ہے کہ ہر قوم کا ایک خاص مزاجِ عقلی ہوتا ہے، جو اختلافِ آب و ہوا اور ملکی و سوشل حالات سے بنتا ہے، یہی شے دو مختلف اقوام میں مابہ الامتیاز ہوتی ہے!

فطرت کے تمام مظاہروں کے مشاہدہ سے "تقریباً" بےخبر تھا! دنیا اُس کی نگاہ میں ایک عجائب خانہ تھی — جہاں قسم قسم کی شکلیں، صورتیں اور آوازیں تو پائی جاتی ہیں، مگر واقفیت بہت کم چیزوں سے ہوتی ہے!

ایسی حالت میں ہر وہ شے جو انسان کی توجہ کو کسی طرح بھی اپنی جانب کھینچ سکتی تھی یا اُس کے لئے مضرت رساں یا منفعت بخش ثابت ہو سکتی تھی، بس اُس کی نگاہ میں ایک آسمانی ہستی (دیوتا) تھی! اور یہی وجہ تھی کہ مثلاً گرجنے والی بجلی بھی اُس کے لئے ایک دیوتا تھی اور روشنی پہنچانے والا سورج بھی، اور انسان کا یہ رجحان بالکل فطری تھا، جس کا استعمال اگرچہ "جہل" کے باعث غلط ہوا، مگر حقیقتاً یہی رجحانات انسانی زندگی کے پاسبان ہوتے ہیں!

لیکن رفتہ رفتہ تمدن کو استحکام ہوا، اور آخرکار انسان کو اپنے ہم جنس مخلوق کے خصوصیات کے مشاہدہ کا بھی موقع ملا — اب کیا تھا، وہی حیرت و استعجاب یہاں کام آ گیا، اور اب وہی "سر" جو پہلے سورج یا دریا کے سامنے جھکتا تھا، اپنے سے بالاتر "انسان" کے آگے جھک گیا —

لیکن ارتقار کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا تھا کہ ذہن میں عقل و شعور کی کیفیت پیدا ہو جاتی، اسلئے اب قوم کا مزاج عقلی چیز بنتا ہے اور اُسے اس امر کا احساس ہونے لگتا ہے، کہ آخر اپنے ہم جنس کے آگے سر جھکانے کے کیا معنی ہیں؟ پھر بھی انسانی ذہنیت ابھی ناقص ہے اور اپنے کمال کو نہیں پہنچی ہے، لیکن نفاست خیال کے خود نے اپنے ہم جنس کی حقیقت کو اس کے سامنے کھول دیا ہے۔ اسلئے اب وہی "بت پرستی" "خدا پرستی" کا قالب اختیار کرتی ہے — اور چونکہ خیالی پرواز پیدا کر دینا تمدن کے ارتقار کا کام ہے، اسلئے اب "مادہ پرستی" "تخئیل پرستی" بنتی ہے جس کا مرتبہ ذہن انسانی کے اعتبار سے بلند تر ہے —

لیکن یہ مزاج عقلی زمانہ کے ساتھ اب پھر کروٹ بدلتا ہے۔ اور اب دماغ انسانی اپنے لیئے " خودی " کا درجہ لاتا ہے جس کے نتیجہ میں " خودپرستی " یا " فطرت پرستی " آتی ہے، جسے دہریت کہتے ہیں ؛ ۔

چنانچہ بت پرستی، خدا پرستی اور دہریت یہ سب ایک ہی چیزیں ہیں، البتہ فرق صرف اسی قدر ہے کہ بت پرستی کا محرک جذبہ یا احساس ہے، اور خدا پرستی یا فطرت پرستی کا محرک شعور و عقل۔ اول الذکر شئے آغاز تمدن کی یادگار ہے، اور آخرالذکر " کمال تمدن " کی پیداوار! مگر جملۂ معترضہ کی طرح ہمیں یہ بھی ظاہر کر دینا ضرور ہے، کہ یہاں عقل و جذبہ کی تقسیم بھی ہم نے عرفی طور پر کی ہے، ورنہ واقعی طور پر عقل کوئی مستقل شئے نہیں، بلکہ جس قدر بھی کیفیات دماغ انسانی پر طاری ہوتے ہیں، ان سب کا مجموعی نام " عقل " ہے، اب اُسے چاہو جس نام سے پکارو، البتہ فرق اتنا ہے کہ ثانی الذکر کو محض جذبہ ہی نہیں بلکہ جذبۂ انسانی کہنا چاہئے!

(۳)

یہ ہے مذہب کا وہ عالمگیر قانون، جس پر اجمالی حیثیت سے ہم کافی روشنی ڈال چکے، البتہ اتنا کہدینا اور ضروری ہے کہ اس قسم کا انقلاب قوموں میں اسوقت آتا ہے۔ جب ان کا مزاج عقلی یا روح تبدیل ہو جائے، اور یہ انقلاب بھی یکایک ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ پہلے تو اپنے موجودہ تمدن کے خلاف رجحانات آہستہ آہستہ ایک مدت تک دماغ میں پکتے رہتے ہیں۔ اور جب یہ تشکیل کی مدت

طلہ مگر اس موقع پر اتنا کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اس وقت مذہب کی بنیاد " قیاسیات " پر رکھی جاتی ہے، اسلئے کہ دماغوں میں کمال طاقت پرواز آجاتی ہے اور یقین مفقود ہو جاتا ہے ۱۲

ختم ہو جاتی ہے تو یکایک کوئی قوی الارادہ شخص اس پرانے خیال کے خلاف جہاد کرنے کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور تمدن کے تختہ کو الٹ دیتا ہے ــــ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا طبقہ اُلٹ گیا۔ مگر حقیقتہً یہ تمام "انقلاب" ایک مدت کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو غیر شعوری حیثیت سے عام نظروں سے اوجھل رہکر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ قانون محض مذہبیات ہی کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ کچھ سیاسیات وغیرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، چنانچہ وہ تمام مظاہر جنہیں آج ہندوستان میں ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ کئی صدیوں کے پیدا وارہیں ..... !

اس جگہ جملہ معترضہ کی طرح ان قوی الارادہ اشخاص کے سلسلہ میں ہم اس نقطہ کو بھی چھیڑے دیتے ہیں۔ کہ حقیقتہً یہی وہ افراد ہوتے ہیں جنہیں گویا کسی قوم کے تمدن حاضرہ اور مستقبل کی درمیانی کڑیاں کہنا چاہئے! یہ اشخاص ہمیشہ مصائب ہی جھیلتے رہتے ہیں۔ اسلئے کہ کسی قدیم تمدن کی موت اور جدید تمدن کا اس کی جگہ لینا ظاہری و باطنی ہر قسم کا انقلاب لاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اقوام اپنے قدیم تمدن سے بہت محبت کرتے ہیں اور بڑی مشکل سے اُسے چھوڑتے ہیں۔ اور یہی وہ موثرات تھے، جن کی بنا پر مثلاً محمد صاحب اور سقراط کو اپنے زمانہ میں خدا پرستی کی تبلیغ میں اُسی قسم کے مصائب جھیلنے پڑے تھے، جن کا آج کسی روشن خیال فلسفی کے لئے مذہب عقلیت کی اشاعت کے باب میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور دونوں قسم کے اشخاص پر اپنے زمانوں میں یکساں طور پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے گئے، درانحالیکہ دونوں کی دماغی پیداوار اپنے دور کے صحیح موثرات میں سے ہے!

دوسری فصل

مذہب عقلیت

ہم مختصر طور پر یہ بیان کر چکے ہیں، کہ بت پرستی ہو یا خدا پرستی - وحدانیت ہو یا دہریت - یہ سب مذاہب ایک ہی جذبۂ انسانی کی مختلف شاخیں ہیں ـــــ اور مختلف موثرات ہیں، جو مختلف زمانوں نے مختلف اقوام میں پیدا کیئے! اور چونکہ دورِ قدیم جہل اور جذبات کا زمانہ تھا۔ اسلیئے دماغ انسانی کی پیداوار بھی کسی قدر ناقص اور ادھوری رہ گئی۔ اور مذہب خدا پرستی اسی قسم کی پیداوار کا ایک نمونہ ہے!

بات یہ ہے کہ جیسا کہ بیان ہو چکا، انسان نے جب بت پرستی سے منہ موڑا، تو نادر یہ لازمی طور پر ہونا تھا کہ پتھر (جسمانی) کے خدا کو توڑ دو خیال (دماغی) کے خدا کو تعمیر کرتا - اور ارتقا کی اس منزل میں بھی عرصہ تک دماغ انسانی کو کام کرنا تھا، لیکن آہستہ آہستہ ارتقا کی وہ منزل بھی آئی جب دماغ انسانی کی پرواز ایک اعلیٰ معیار پر پہنچ گئی، اور اب وہ ذی شعور حیوان کا کامل ثبوت دینے لگا۔ ایسی صورت میں یہ لازمی بات تھی کہ وہ اپنے تمام مسائل زندگی پر عقل کی روشنی میں استدلال قائم کرتا یہی وجہ تھی کہ جذبۂ خدا پرستی اب مسئلہ خدا پرستی بن گیا! پھر زور دلائل بھی اس کے اثبات میں دماغ نے گھڑ لئے ـــــ اور دماغ تو اس کام میں بہت مشاق ہے!

لیکن فطرت کو قرار کہاں، ارتقا کے ساتھ ساتھ تمام مشاعر و احساسات بھی اپنی حیثیتیں بدلتے گئے، اور آخر کار انسان نے یہ راز پا لیا کہ مسئلہ خدا پرستی بھی ایک جذبہ ہے، اور ایک عقیدہ ہے جو خالص عقل پر پورا نہیں اترتا ـــــ! اس لئے کہ

اب عقلِ انسانی کی حیثیت بدل گئی تھی۔ اس وقت اس عقیدہ کے متعلق بھی جرح و قدح کا دروازہ کھل گیا۔ اور بہت دیر میں یہ راز آشکار ہوا، کہ دماغ انسانی کی وہ مقدس تخلیق (خدا) در اصل فطرت انسانی ہی کا ایک بلند آئیڈیل ہے، یعنی انسان نے اپنے دماغ کی غیر پختگی کے عالم میں دورِ جہالت کے نیچے کھچے اثر سے کام لیکر اپنی ہی جنس (صفات) کا ایک بلند ترین تخیل اپنی بساط کے مطابق تیار کیا، اور اُن تمام صفات کا جو انسان میں اُس زمانہ کی ذہنیت کے مطابق پائے جاتے تھے، اُسے ایک مجموعہ[1] بنا دیا۔ تمام عیوب انسانی سے اس خیالی مظہر کو آزاد کر دیا۔ (درانحالیکہ اپنی اس کوشش میں وہ ناکام رہا۔ اسلئے کہ ہر صاحبِ صفات ذات میں عیوب کا پایا جانا بھی ضروری ہے) اور پھر اپنے اس ذہنی بُت کو دونوں جہان کی قدرت بھی دے دی۔ اور آخرکار اپنی مخلوق کا خود مخلوق بن بیٹھا!

لیکن اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ اس وہم کی حقیقت بھی تمام عالم پر آشکارا ہو گئی ہے، اور اب ہمیں یہ نظر آنے لگا ہے، کہ ان اوصاف کے خدا کے لئے تو ہونا بھی لازمی ہے۔ اور اگر حقیقتہً کوئی خدا ہوتا بھی تو وہ ہمیں اس وہم اور امید و بیم کے عالم میں کیوں مبتلا کر دیتا؟ اور دنیا کو ضلالت و گمرہی سے کیوں نہ نجات دلاتا؟ اور پھر ہمیں یہ بھی دکھائی دینے لگا ہے، کہ اگر کوئی حقیقت ہمارے لئے قابلِ اعتماد ہے بھی، تو وہ یہی "نیچر" یا "مادہ" ہے۔

---

[1] ہمارے اس نظریہ کی شہادت وہ عالمگیر قانونِ قدرت دے رہا ہے، جس کے تحت ہیں دنیا کے مختلف اقوام اپنی ہی نفسیات کے مطابق اپنے "معبود" بھی مختلف بنائے ہوئے ہیں، مثلاً یونانی اگر جنگجو ہیں تو انکا خدا انکی مجسمہ "استبداد" ہے۔ یہودی غصہ کو مقدس مانتے ہیں، اور قدما فیاض دیوی "ایرس" کے اوصاف میں حسد کو بھی محسوب کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

ہم کو اپنی زندگی میں اسی تجربے سے واسطہ ہے، جو ہمارے ظاہری و باطنی دونوں عالموں کا سرمایہ ہے! اگر ہماری روح بھی کچھ ہو سکتی ہے، تو وہ یہی تجربہ ہے، تجربہ ہمارے مشاہدہ کے اندر بھی ہے، اور باہر بھی، ہم تجربے کے فرزند ہیں، پھر ہمیں اس میں اپنا حصّہ لینا چاہیئے۔ پھر ہم کو اس کی قدر و قیمت پہچاننی چاہیئے! اور اگلے وقتوں کے لوگ جو اس زندگی کو ہیچ پوچ سمجھتے تھے، ہم کو ان کی حالت پر رحم کرنا چاہیئے! اس لئے کہ وہ نادان تھے، جو ایک وہم میں مبتلا رہے۔ اور جنہوں نے یہ نہ جانا کہ یہ دنیا کیا ہے؟ اور زندگی کسے کہتے ہیں؟ انہیں اس کی خبر نہ تھی کہ یہ "کائنات" فطرت یا جادو کا ایک سمندر ہے، جس کا ظاہر باطن سے زیادہ پُراسرار ہے اور باطن ظاہر سے زیادہ روشن! اور ہماری موت بھی زندگی ہی کا ایک پرتو ہے، جو کسی حیثیت سے بھی بے اثر نہیں!

اس لئے ہم کو اپنی زندگی کے تمام مظاہر کی قدر کرنی چاہیئے! اور موت سے مطلقاً ڈرنا نہیں چاہیئے، اسلئے کہ وہ بھی تو ہماری حیات حاضرہ ہی کا ایک دوسرا رخ ہے!

۱ؔ اگرچہ میں ایک عرصہ تک مشکک رہا، جس کے آثار میری پرانی تصنیف "پیام جاوید" میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اب میں نے اپنے دیرینہ خیال کی غلطی کو پالیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر مسئلہ میں پہلے قدرتی طور پر انسان شک میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے بعد یقین کا درجہ آتا ہے۔

تیسری فصل

پارینہ مذاہب کی ساخت

مذہب کا تعلق براہ راست عوام سے ہے ۔۔ فقدان عقل جن کا وصف امتیازی ہے، اسلئے فلسفہ اور حقائق کا ادراک ان کے ذہن سے بالاتر شے ہے!
یہی وجہ تھی کہ اب تک جس قدر بھی بانیان مذاہب گذرے ہیں، انہیں بھی اپنے خیالات کو عوام کے ذہن کے مطابق بنانا پڑا ہے ۔ اور جس مقصد کے حصول میں کارگر اسلحہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مدعیانہ و متحکمانہ طرز کلام اور استدلال سے گریز، جو طریقۂ اشاعت کہ تمام عامی مذاہب اور قوانین عدالت کے نفاذ میں پیش نظر رکھا جاتا ہے ۔۔ و نیز بانیان مذاہب کے مختلف قسم کے دعوی (مثلاً نبوت وغیرہ) بھی اسی پالیسی کے تحت میں آتے ہیں۔

۲۔ تمثیل بیانی، یعنی اپنے خیال کو تشبیہہ و استعارہ کی شکل میں بیان کرنا، ہمارا یہ طرز عمل اگرچہ اصل حقیقت پر ملمع کا رنگ چڑھا کر واقعہ کو کچھ سے کچھ کر دیتا ہے مگر اپنے مقصد میں کامیابی متذکرہ اصول کو کام میں لائے بغیر ممکن نہیں! جس کی مثال میں ہم جنت و دوزخ اور قیامت وغیرہ کو پیش کر سکتے ہیں!

۳۔ تکرار، یعنی اپنے مطلب کو بار بار دہرانا اور اس کے لیے مختلف انداز بیان اور اسلوب تلاش کرنا چنانچہ یہ شے بھی ہمیں تمام مذہبی کتب کی عبارتوں اور ان کے ہدایات میں ملتی ہے!

۴۔ تعدیۂ اثر۔ یعنی اس امر کی کوشش کرنا کہ اس طریقہ سے جو اثر کسی ایک شخص پر پڑ گیا ہے، وہ پھیلکر تمام جماعت پر چھا جائے!! اور یہ شئے محض مذہبی کتب ہی میں نہیں بلکہ پیشواؤں کی طرز زندگی میں بھی پائی جاتی ہے!

چنانچہ اس زمرے میں خطبا اور مقررین کی تقریریں بھی شامل ہیں اور بانیان مذاہب کی تبلیغیں بھی! جو خطبوں کی طرح جس قدر معنی آفرینی سے پاک ہوتی ہیں اسی قدر جوش اور جدت بیان میں قابل لحاظ! اور اس خصوصیت میں بانیان مذاہب کی فقط تبلیغ ہی نہیں آتی۔ بلکہ ان کی زندگی بھی آتی ہے (جیسا کہ بیان ہو چکا ہے) جو اگرچہ ایک استعارہ ہوتی ہے مگر معتقدین کی نگاہ میں ایک ٹھوس اور منضبط شخصیت! لیکن نکتہ رس نگاہ اس حقیقت کو پا لیتی ہے، کہ آیا کہاں تک ان کے اوصاف میں مبالغہ کا رنگ چڑھا ہوا ہے! البتہ عام نگاہیں اندرونی موثرات سے گذر نہیں سکتیں۔ اور ان کا فقدان شعور ان میں اس دزنی پتھر کے اٹھانے کی طاقت پیدا نہیں ہونے دیتا ——— اور ظاہر ہے کہ جب کسی خیال میں استدلال کی شرکت نہیں ہوتی تو اسی کا نام عقیدہ ہے!

یہ عقیدہ عوام کیلئے بڑی موثر شے ہے، اسلئے کہ شخصی رائے سے جماعت بے بہرہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بجز اپنے پیشہ کے اور زندگی کے کسی موضوع پر سوچنے کی جماعت میں بالکل صلاحیت نہیں ہوتی، یہی وجہ ہو کہ اسے قدرتی طور پر کسی ہادی یا لیڈر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اسوقت یہی عقیدہ اس کا رہبر بن جاتا ہے، جو گویا کسی شخص یا خیال کو اس کے سامنے قادر مطلق بنا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

اس قسم کے رہبر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ گویا اس کی مرضی جماعت کی مرضی کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس غیر شعوری کے عالم میں جو افعال جماعت سے سرزد ہوتے ہیں۔ ان کی نگہداشت بھی یہی عقیدہ کرتا ہے! یہی وجہ ہے کہ مذہبی دنیا

میں تو عبادت کو بڑی عظمت دی گئی ہے۔ لیکن ہم لطیفہ کے طور پر یہ جملہ بھی کہے دیتے ہیں
کہ جو نیک اعمال یا عبادات اس غیر شعوری کے عالم میں انسان سے صادر ہوتے
ہیں، کوئی بتا سکتا ہے کہ اس میں شخصی ارادہ کی شرکت کہاں تک ہے؟ اور اسلئے
دنیائے عقل میں اسکی کیا حیثیت ہے؟ میرا جواب تو یہ ہوگا کہ ایک ذی شعور انسان
کی وقتی بدکاری بھی اس قسم کی زندگی بھر کی عبادت پر افضل ہے! جس میں عقل و ارادہ
کا عنصر شریک نہ ہو۔

بہر حال اس عقیدہ کو توڑ دینے کی آسان صورت یہ ہے کہ اُن معتقدات کو
بحث و مباحثہ کی زد پر لگا دیا جائے۔ ایسی صورت میں "عقیدہ" (جو ایک غیر شعوری
کیفیت کا نام ہے) کے دن پورے ہو جاتے ہیں، اور شعور و ادراک کا وجود اُسے
فنا کر ڈالتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے، کہ وہ مذہبی عقاید جو کئی ہزار برس تک دماغوں
پر حکمرانی کرتے رہے، دورِ حاضرہ (جسے عقل و شعور کا زمانہ کہتے ہیں) میں زیر و زبر
ہو کر دور پڑے جاتے ہیں! اور اگر زمانہ اسی رفتار سے آگے بڑھتا گیا تو یہ قدیم مذاہب
کی عمارتیں (جو دورِ قدیمہ میں تعمیر ہوئی تھیں، اور اسی لئے ان کی بنیادیں بھی عقائد
پر رکھی گئی تھیں) بہت جلد ڈھا جائیں گی۔ اور ان کی جگہ ایک دنیائے عقل آباد
کی جائیگی جس میں اعلیٰ ذہنیت کا دور دورہ ہوگا! عبادت کا مقام ایسے اعمال لینگے
جن کا تعلق ہماری روشن زندگی سے ہے۔ اور آسمانی کتابوں کی جگہ فلاسفہ کی تصنیفات
پڑھی جائیں گی!

~~~
~~~

چوتھی فصل

معجزہ

یہ حقیقت بیان ہو چکی ہے، کہ مذہب کے نفسیاتی اجزا، چند دلچسپ توہمات کے سوا اور کچھ نہیں — جو معتقدات کی شکل میں اپنے پیروں کے ذہنوں میں گھر کیئے ہوتے ہیں! و نیز جس قدر زیادہ یہ توہمات کسی دیرینہ[1] قسم کے مذہب میں پائی جاتے ہیں۔ اسی قدر عوام کی توجہ کو اپنی جانب جذب کرنے میں وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے!

چنانچہ بانیانِ مذاہب کی کتابوں کا الہام سے منسوب کیا جانا یا بعض اُن کے افعال (جن کی حیثیت اگرچہ عام ذہنیتوں سے مختلف ضرور ہوتی ہے) کو ماوراء عمل (معجزہ) قرار دینا، اسی کے تحت میں آتا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ دنیا اِن افعال کا مرتکب ایک انسان ہی کو پاتی ہے، پھر بھی اُسے انسانی طاقت سے بالاتر بتاتی ہے؟ کیا شیکسپیئر اور فردوسی کا جواب آسان ہے؟ جو آسمانی[2] کتابوں کا جواب ناممکن

---

[1] زمانہ کے مذاہب متداولہ مثلاً عیسائیت، اسلام اور ہندو مت وغیرہ۔

[2] اگرچہ اس دعویٰ پر بھی میرا یہ اعتراض ہو کہ ہمارے پاس اسکا ثبوت ہی کیا ہے؟ کہ مثلاً قرآن کا جواب اہلِ عرب نے نہیں دیا! اسلئے کہ ہمارے پاس جسقدر بھی تاریخی روایات ہیں، وہ سب مسلمانوں ہی کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کا جواب یا تھا (بقیہ حاشیہ ص ۱۷ پر)

جاتا ہے، اور اس طرح ان کے آسمانی کتب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور دماغِ انسانی کو محدود بنا دیا جاتا ہے!!

عوام کی ذہنیت کچھ عجیب توہم پرست واقع ہوئی ہے، وہ ہر اُس ذات کو جسے وہ اپنی ذہنیت سے بالاتر پاتی ہے، "دیوتا" بنا دیتی ہے، چنانچہ "مہاتما گاندھی" کے متعلق بھی یہ عقیدہ شائع ہوا تھا، کہ اُن کی دُعا سے غیر جنس درختوں سے روئی اُگ آئی، اور اگر یہ زمانہ "علمی دور" نہ ہوتا، تو یقیناً "گاندھی" بھی مثل رام یا کرشن یا محمدؐ وغیرہ کے ایک پیغمبر یا دیوتا بن گئے تھے!!

جماعت کو کبھی صحیح روشنی نظر نہیں آتی ہے ـــــ اسلئے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی جماعت کی نگاہوں میں اپنا کوئی مقام پیدا کرنے کیلئے خود کو ایک "عجوبہ" یا "محیر العقول" ہستی دکھانا پڑتا ہے! اسلئے اکثر قائدین اور بانیانِ مذاہب کو یہ محض اس راز کو پیش نظر رکھکر اپنے دور "قدیم" کے مذاق کا لحاظ کرنا پڑا۔ جو زمانہ گزرنے کے بعد آج مہلک نظر آ رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ علم و عقل کا دور ہے، اس لئے اب کوئی اصلی راہنما ایسا ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) مسلمان انہیں تسلیم کیونکر کر سکتے تھے؟ چنانچہ اُن کفاروں کے نزدیک قرآن کا جواب ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں نے انہیں تسلیم نہیں کیا، اور ظاہر ہے کہ جب کسی فرقہ کی سیاسی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ تو پھر اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا، اور پھر کسی کے اعتقاد کو بدل دینا تو بہت مشکل کام ہے! بات یہ ہے کہ جب کسی ذات یا شے سے کوئی عقیدت پیدا ہو جاتی ہے تو پس وہی اسکی نگاہ میں اسکا اصلی معیار بن جاتی ہے، مثال کے طور پر غالب کے معتقدین آج اسکے عیوب کو بھی اچھا جانتے ہیں۔ اور وہ فارسی کی ٹھوس ترکیبیں جو غالب کی کمزوریاں ہیں۔ اُنہیں بھی قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی تقلید کی جاتی ہے۔ اور ان ہی کو معیار بھی بنایا جاتا ہے!

کو اختیار بھی نہیں کرتا ــــ جو علم و عقل کو زخمی کرنیوالی ہیں! لیکن یہ ظاہر ہے، کہ جو خیالات دلوں میں پیوست ہو جاتے ہیں، وہ ذرا مشکل سے نکلتے ہیں، اس لئے یہ توہمات آج ارتقاء ذہنی میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ اور خیالات میں خاص قسم کا ہیجان اور کشمکش ہے! جسے دُور ہونے میں ابھی صدیاں درکار ہیں!!

جیسا کہ بیان ہو چکا، کہ مذہبی موثرات سے روشن عقلیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں اسلیئے آج کئی تعلیم یافتہ دماغ ہیں، جو اگرچہ مسمریزم کی ماہیت اور طاقت سے آشنا ہیں پھر بھی اس نکتہ کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ مثلاً "شق القمر"[1] کا معجزہ بھی اسی قسم کا ایک

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہو کہ یہ معجزہ صحیح تاریخی روایات میں نہیں ملتا۔ بلکہ جس طرح بہت سی باتیں یونہی مشہور ہو جاتی ہیں۔ اُنہی میں سے ایک یہ بھی ہے۔ مگر میری غرض اس مقام پر اس معجزہ سے خاص طور پر نہیں تھی۔ بلکہ مثال کے طور پر مجھے یہ دکھانا تھا کہ مذہبی رہنماؤں کے متعلق اس قسم کی باتیں حسن عقیدت کی بنا پر مشہور ہو جاتی ہیں ــ جن کا انسانی زندگی سے کوئی واسطہ بھی نہیں ہوتا ــــ اس معجزہ کو پیش کرنے سے مجھے کسی خاص ذات یا فرقہ کی توہین بھی مقصود نہیں۔ بلکہ زمانہ کے ناقص خیالات کی اصلاح منظور رہی ہے اور فقط اصلاح! اور یہ دکھانا ہے کہ یہ تمام معجزات کا "مسمریزم" سے کام لینے سے ہماری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتے ہیں، انہی معجزات کی ایک تاریخ چند سال پہلے پنجاب میں بھی لکھی گئی ہے ــــ جس کے ہیرو مرزا غلام احمد قادیانی تھے یعنی وہ تمام پیشین گوئیاں جو ہر ذی فہم، اگر وہ نفسیات جماعت کا کچھ علم رکھتا ہو۔ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ انہیں آج معجزات کہا جاتا ہے۔ مرزا صاحب اس امر سے آشنا تھے کہ جماعت کسی بات کو جلدی قبول نہیں کرتی، اسلئے وہ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے، چنانچہ ان کے استقلال نے جب جماعت کے ذہن میں اپنا گھر لیا تو ان کی ہر بات ایک معجزہ بن گئی۔

کرشمہ تھا! جو ایک جماعت کے سامنے کسی خاص مصلحت کو پیش نظر رکھکر تیرہ سو برس پہلے عمل میں لایا گیا تھا!

پھر غضب تو یہ ہے کہ جماعت میں شریک ہوکر ایک ذی شعور انسان کی بھی عقل بدہم اور شعور غائب ہو جاتا ہے۔ اسلئے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی اُسے محو حیرت بنا دینے میں کافی ہوتی ہے! اور پھر کسی ایک دماغ پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے، تعدیۂ اثر کی بنا پر وہی کیفیت تمام افراد جماعت میں پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ یہ جسقدر بھی معجزات قِسم کیا اور کہانیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں، ان کی شان یہی ہے کہ یہ سب بعض قوی الارادہ اشخاص (پیغمبر یا رہنما وغیرہ) کے اقوال و اعمال ہیں، جنہیں سب سے پہلے جماعت کی کسی ایک فرد نے غلط طریقہ پر سمجھا ہے اور پھر تعدیۂ اثر کی بنا پر یہ خیال تمام جماعت میں پھیل گیا ہے (جیسا کہ مذکورۂ بالا ہے)!

جماعت کی اس اثر پذیری اور تعدیۂ اثر کی چند مثالیں مشہور فرنچ فلاسفر لیبان نے اپنی ایک لاجواب کتاب دی کراؤڈ میں پیش کی ہیں۔ جن کو پیش لینے کے بعد اس قسم کے عقیدے نہایت آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

" ایک بار موسیو ڈیوی نے یورپ کے سائنس دان ماہرین کو جن میں انگلستان کا مشہور عالم مسٹر ولیس بھی تھا۔ اس بات کی دعوت دی کہ وہ ایک جگہ جمع ہوکر اس کے حیرت انگیز طلسمی اعمال کا مشاہدہ کریں۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے، تو موسیو ڈیوی نے ان کے سامنے کچھ چیزیں پیش کیں۔ اور ان کو اجازت دی کہ ان اشیاء پر جہاں جہاں چاہیں۔ مہر لگا دیں، پھر ان کے سامنے موسیو ڈیوی نے تمام وہ طریقے استعمال کئے جو فن استحضار ارواح اور فن تجسیم ارواح میں استعمال کئے جاتے ہیں۔۔ یہ اعمال اسقدر حیرت انگیز تھے کہ ان کو دیکھکر سارے مجمع نے جو اکابر علماء پر مشتمل تھا، موسیو ڈیوی کو اس مضمون کے سارٹیفکیٹ دیئے کہ یہ باتیں

اسوقت ہمارے سامنے گذریں۔ وہ طاقت بشری سے بالاتر تھیں۔ لیکن جب
یہ سارٹیفکیٹ موسیو ڈیوی کے ہاتھ میں آگئے۔ اسوقت اس نے مجمع کے سامنے یہ
اقرار کیا کہ یہ سارے کا سارا کھیل ایک شعبدہ تھا"

چنانچہ جب اس قسم کا اثر روشن خیال علماء پر ڈالا جا سکتا ہے، تو عوام الناس
بھلا کس شمار میں ہیں! اسی قسم کا ایک اور واقعہ لیبان لکھتا ہے:۔

"شہر پیرس میں ایک مقام پر کسی بچہ کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ اتفاقاً ایک دوسرا
لڑکا ادھر آ نکلا، اور اس نے بیان کیا کہ یہ میرے ایک ہمدرس دوست کی لاش ہے
دوسرے دن اس کی ماں طلب کی گئی، وہ لاش کو دیکھتے ہی چلا اٹھی کہ یہ میرا بچہ ہے
جو ماہ جولائی سے لاپتہ ہو گیا تھا، لوگ اُسے پکڑ لے گئے۔ اور اب اُسے قتل کر کے اس
مقام پر چھوڑ گئے۔ اس عورت کا نام چاونڈ ریٹ تھا۔ اس کے بعد اس کی ماں کے
بہنوئی کو اطلاع ہوئی جس نے آکر بیان کیا کہ یہ میرے بھانجے کی لاش ہے ——
اس کے بعد ججوں نے مزید شہادتیں اور طلب کیں، جنہیں اس لڑکے کے اسکول ماسٹر
کی شہادت بھی تھی —— اسکول ماسٹر نے لاش کی گردن میں سونے کا تمغہ دیکھکر کہا
کہ یہ بچہ اسی محومت کا ہے اور اسکی شناخت یہ ہے کہ اس لاش کے گلے میں جو
تمغہ پڑا ہوا ہے۔ یہ وہی ہے جو اس بچہ کو اسکول سے انعام میں ملا تھا —— کیا
کسی دعوے کی تائید میں اس سے زیادہ قطعی شہادت آسانی سے تصور میں آ
سکتی ہے؟ لیکن واقعات مابعد سے ثابت ہو گیا۔ کہ یہ تمام ذخیرۂ شہادت مجموعہ
خرافات تھا —— چھ ہفتے کے بعد پتہ لگا کہ واقعةً جس لڑکے کی یہ لاش تھی وہ
پیرس کا تھا ہی نہیں، اور یہ لاش شہر بورڈو کے ایک لڑکے کی تھی۔ جسے ایک
کمپنی شہر پیرس میں اٹھا لائی تھی۔ چنانچہ بالآخر خالہ، استاد، کلاس فیلو، اور
دیگر معززین گواہوں میں سے سب نے اپنی غلط شناسی کا اعتراف کیا"

بلکہ یہ ہے عوام کی ذہنیت! اور یہ ہے وہ کیفیت جو جماعت میں شریک ہوکر ہر فردی شعور انسان پر طاری ہو جاتی ہے!!

پانچویں فصل

مذہب میں سیاسی اجزاء

یہ حقیقت متعدد مقامات پر بیان ہو چکی ہے، کہ وہ تمام مذاہب جو عوام الناس کی خاطر بنائے گئے ہیں۔ ان میں سیاسی اجزا ہمیشہ شریک رہے ہیں ——— اگرچہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تو اسے جھوٹ کی آمیزش کہنا چاہیئے۔ تاہم افادی نقطۂ نظر سے ممکن ہے کہ اُس تاریکی زمانہ میں بانیانِ مذاہب کا یہ "طرزِ عمل" بعض حقیقتوں کو ان کی نیک نیتی پر روشنی ڈال سکے۔

یہی وجہ تھی کہ مثلاً اسلام نے اپنی اشاعت کی یہ آسان تدبیر نکالی۔ کہ اُن تمام مذاہب (عیسائیت اور یہودیت وغیرہ) کو جو اس سے قبل، اس ملک (عرب) میں پھیل چکے تھے، اور جن کے پیرووں سے اُس کا سامنا تھا، انہیں بھی اپنے مذہب میں شریک کر لیا، اور اسلام کو گویا اُن تمام مذاہب کی آوازِ بازگشت یا ایک ارتقائی صورت بنا یا، تاکہ ان کے پیرو بھی اسلام کو خوشی کے ساتھ لبیک کہیں۔ اور وہ سب اسلامی جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو جائیں!

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اسلام نے بہت کچھ اسرائیلی مذاہب سے استفادہ کیا ہے اور قرآن کا اکثر مواد انجیل و توریت سے ماخوذ ہے ——،

تاہم جس طرح دنیا میں دو دماغ کلی حیثیت سے ایک نہیں ہو سکتے ، اسی طرح دو مختلف مذاہب بھی بالکل یکساں نہیں ہو سکتے ۔ البتہ ایک مثال بہت سی پائی جا سکتی ہے!
چنانچہ آج اگر ایک منصف مزاج اور صاحب نظر نقاد مثلاً اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرتا ہے، تو صحیح معنوں میں یہ دونوں مذاہب دو مختلف چہرے معلوم ہوتے ہیں ۔ جنہیں تشابہ پیدا کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں! اگر ایک مثلاً توشئی محض ہے تو دوسرا مجسمہ استبداد ۔

مگر بانیان مذاہب کا یہ طرز عمل ہمیشہ اپنے پیروؤں کے حق میں یہ ذہنی مغالطہ لایا کہ وہ دنیا کے تمام مذاہب کو اپنے ہی مذہب کے بگڑے ہوئے نقوش سمجھنے لگے ۔ اور اس طرح دوسروں کی طرف سے حقارت اور اپنی عظمت دلوں میں جاگزیں ہو گئی جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہونا تھا کہ مذاہب کے متعلق نقد و تبصرہ کا دروازہ مسدود ہو گیا ۔ اور ایک مذہب کے مقلدین دوسرے مذہب کی ہر شئے کو اپنے ہی مذہب کی عینک سے دیکھنے لگے ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج ہم تمام مذاہب کے پیروؤں کو ذہنی جمود میں شدت کے ساتھ مبتلا پاتے ہیں ۔ اور اسی بنا پر ہر مذہب کا مقلد دیگر مذاہب عالم کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے ۔ اور انہیں اپنے ہی مذہب کا ایک ناقص حصہ قرار دیتا ہے!

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو مذہب (مثلاً اسلام) جسقدر جدید تر ہوگا اسی قدر اس کے پیروؤں کو اس قسم کے غلط دعوی کرنے کا زیادہ موقع ملیگا!

دیکھو! یہی ہے وہ ذہنیت جو پارینہ مذاہب (جن پر اصطلاحی معنوں میں مذہب

سلہ اس بحث سے مجھے اسرائیلی اسکول آف ریلیجن کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنا مقصود ہے ۱۲

کا اطلاق ہو سکتا ہے، بنی نوع انسانی کو دے گئے ہیں!

چھٹی فصل

آسمانی مذہب ذہن کے فطری ارتقا میں ایک رکاوٹ ہے

اس نکتہ پر متعدد بار روشنی ڈالی جا چکی ہے، کہ مذہب کا بہت کچھ تعلق انسان کے ذہن کے غیر شعوری حصہ سے ہے یعنی اس کے قوانین روشن اور نمایاں صورت نہیں رکھتے۔ بلکہ جس قدر زیادہ کوئی مذہب آسمانی کہا جا سکتا ہے، اسی قدر وہ ایک زیادہ "پُراسرار" ہوتا ہے ــــ مثلاً آدم کا جنت سے نکالا جانا۔ اور شیطان کا آدم کو سجدہ نہ کرنا۔ حضرت الیاس یا خضر کا حیات جاوداں پانا۔ اور حضرت عیسیٰ کا مردے زندہ کرنا یا ان کا چوتھے آسمان پر چلا جانا۔ حضرت نوح کی دعا سے ایک تنور سے طوفان آنا اور اس کا تمام عالم کو غرق کر دینا۔ عرش۔ کرسی، دوزخ و جنت وغیرہ ــــ یہ سب کہانیاں ہیں جو آہستہ آہستہ بچہ کے نفسیات میں پیوست کر دی جاتی ہیں۔ نہیں بلکہ قومی نفسیات میں صدیوں کی کوششوں کے نتیجہ سے پیوست ہو گئی ہیں۔ اور جنہوں نے اب طلسموں کی صورت اختیار کر لی ہے، جنہیں یا تو توڑنے کی تدبیر نکالو ورنہ وہ خود تمہیں ہضم کر جائینگے!

چنانچہ یہ اور ایسی قسم کے "مختلف الشکل" اوہام ہیں، جو تمام مروجہ مذاہب میں بکھرے پڑے ہیں۔ اور کوئی مذہب جس قدر زیادہ پرانا ہوتا ہے، اسی قدر اس قسم کے اوہام کی مقدار اس میں بڑھ جاتی ہے! چنانچہ آج اسلام یا عیسائیت ہی نہیں، بلکہ ہندومت[1] ہماری نگاہ میں سب سے زیادہ مجموعۂ اوہام ہے! مثلاً کرن کا کان سے

[1] اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ "ہندومت" دیگر مذاہب عالم (عیسائیت، اسلام وغیرہ) سے

پیدا ہوتا، نہیں بلکہ اس سے زیادہ تو اُس کے اصول، اوّلیں مجموعۂ اوہام ہیں۔ مثلاً خدا کا لباسِ مجازیں میں آنا اور کرشن درام کا قالب اختیار کرنا۔ مسئلہ تناسخ وغیرہ۔ جنمیں سے بعض اصول اگرچہ فلسفہ کی مستقل شاخیں بھی ہیں جو مستقل بحثیں چاہتے ہیں لیکن اس کتاب کا موضوع خاص طور پر مابعد الطبیعات نہیں ہے، اسلئے اسے کسی آئندہ تصنیف کیلئے چھوڑتا ہوں! البتہ اس مقام پر مسئلہ تناسخ پر روشنی ڈالنا نہایت اہم سمجھتا ہوں۔

ابطالِ تناسخ

(پہلی دلیل) کیا تناسخ کے ابطال میں اس سے بڑی کوئی اور دلیل ہوسکتی ہے؟ کہ ہمیں اپنے پہلے جنم کی مطلقاً خبر نہیں! ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم اس زندگی سے پہلے کس قالب (حیوان یا انسان میں تھے؟) اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ آخر اپنے پہلے قالب میں ہم سے گناہ سرزد ہوئے تھے یا نیکیاں؟ پھر ہم موجودہ قالب میں اپنی اصلاح کریں تو کیا کریں۔

(دوسری دلیل) ہم اس حقیقت سے بھی کسی طرح انکار نہیں کرسکتے کہ اگر روح کی کوئی حقیقت ہے بھی تو وہ ہمیشہ جسم کے ساتھ رہ کر کام کرسکتی ہے: مثال کے طور پر روح انسان میں بھی، حیوان میں بھی اور درخت میں بھی، مگر کیا سب روحوں کے اختیارات اور خصوصیات ایک سے ہیں؟ ——— اور کیا کسی ایک صنف کی

(بقیہ حاشیہ ۳۲) کی طرح کوئی مستقل اور انفرادی مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کی شان ملکی کلچر کی ہے یعنی ہندوستان میں جس قدر بھی حالات و واقعات پیش آئے اور جتنے بھی فلسفہ کے سکول نکلے، اُن سب کے مجموعہ کا نام ہندومت رکھا گیا ہے۔ اسلئے اس میں خوبؔ کے ساتھ زشتؔ کی بھی آمیزش زیادہ ہونی چاہئے تھی!

روح بھی اپنے جسمانی خصوصیات کے خلاف کام کرسکتی ہے؟ جو امر کہ ناممکنات سے ہے۔ اسلئے ہم اس نتیجہ تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ کہ جب دوسرے جنم میں ہمارے خصوصیات اور اختیارات ہی بدلجاتے ہیں تو پھر ہمارے "اعمال" کا صحیح امتحان کہاں ہوسکتا ہے؟

(تیسری دلیل) پھر ہم یہ دعویٰ بھی بآسانی کرسکتے ہیں کہ یہ تینوں اصناف کے مخلوق زمان ومکان کے تاثرات بھی قبول کرتے ہیں، اور جن میں اوّل الذکر صنف (انسان) تو دراصل اپنے ماحول[۱] کا فرزند ہی ہے! ۔ جو وقت، جگہ، آب وہوا، تہذیب وتمدن و نیز دیگر قسم کے موثرات کو سب سے زائد قبول کرتا ہے، اسلئے ثابت ہوا، کہ روح کی تشکیل میں بہت بڑا دخل ان مادی وجسمانی خصوصیات کو ہے۔ پھر اسی بحث کو پیش نظر رکھ کر محض مسئلہ تناسخ ہی نہیں بلکہ روح کے اُس "وجودی نظریہ" (جسے تمام مذاہب عالم پیش کرتے ہیں) کو بھی ہم باطل قرار دے سکتے ہیں۔ اور نیز وہ عظیم الشان قانون (الوہیت) بھی لغو ومنسوخ ہوا جاتا ہے۔ اسلئے کہ جب روح کا وجود ہی نہیں تو پھر خدا کی کیا ضرورت؟

(چوتھی دلیل) مسئلہ تناسخ کو مان لینے کے بعد ہمیں چند مستقل روحوں کو تو مانا ہی لینا پڑے گا ــــ کم از کم اسقدر روحیں کہ جسقدر اصناف مخلوقات ہیں، مگر جب ایک سے زائد مستقل روحیں ہم نے مان لیں، تو پھر تمام مخلوقات عالم کو مستقل ارواح ماننے میں کیا نقص وارد ہوسکتا ہے؟

(پانچویں دلیل) اگر مسئلہ تناسخ کو صحیح مان لیا جائے۔ تو پھر دنیا کی آبادی ازل سے ایک معینہ تعداد میں ہی چاہیئے تھی، درانحالیکہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں، کہ اس تعداد میں روزمرہ اضافہ ہوتا جاتا ہے، جو حقیقت کہ اس مسئلہ کو ایک وہم لایعنی ثابت کررہی ہے!

۱؎ محض ماحول نہیں بلکہ آبائی وخاندانی خصوصیات بھی!

غرضیکہ یہ مسئلہ (تناسخ) بھی ان چند اوہام میں سے ہے، جو دماغ انسانی کی ارتقاء کے ابتدائی منازل کی پیداوار ہیں، اور اسلئے وہ انہیں مذاہب یا نظام فلسفہ کے جزو ہیں، جو قدیم سوسائٹی کے لئے بنائے گئے تھے، اور وہ اسلئے آج کسی طرح قابل تسلیم نہیں!

اسلام اور دیگر اسرائیلی مذاہب کا مابعد الطبیعیات بھی کچھ اس سے بہتر نہیں، بلکہ اُسے تو اس نام سے پکارنا ہی لاعلمی کی دلیل ہے۔ وہ محض ایک استعارہ ہے اور ایک سیاست ہے، جسے یا تو عقلی حیثیت سے ماوراء سمجھ لو، ورنہ جس قدر سوچتے جاؤ گے، اُس کا لطف کم ہوتا جائیگا!

میں کہہ چکا ہوں کہ ہر مذہب اپنے زمانہ اور ملک وقوم کے موثرات کا مظہر ہوتا ہے، چنانچہ مثلاً ہندوستان (جو ایک زراعتی ملک ہے) میں گوشت خوری انسانی زندگی کیلئے ضروری نہیں! اسلئے اسے بُدھ مت نے محض ایک لطیف جذبۂ رحم کو متاثر ہو کر حرام قرار دیا، اور جسے بعد کو آسمانی روح کا پیغام سمجھا گیا! مگر اصلیت یہ ہے، کہ جب ہم عقلی حیثیت سے یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان فطرت کا فرزند ہے اور قانون قدرت تمام کمزور طاقتوں کو قوی تر طاقتوں کا محکوم بناتے ہوئے ہے تو پھر ہمیں پست درجہ مخلوق کو اپنے کام میں لانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے! بڑی مشکل تو یہ ہے کہ رحم کے مسئلہ کا سمجھنا ہماری زندگی کیلئے جس قدر اہم ہے، اُسی قدر نازک بھی —— اسلئے کہ انسان ہر بات کو صحیح روشنی میں عموماً نہیں دیکھتا!

مسئلہ رحم

مثل دیگر مسائل کے اس مسئلہ پر بھی دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے:-

(۱) محض جذباتی — اور اس نقطۂ نظر کو خواہ شخصی حیثیت سے کوئی اعلیٰ مقام دیدیا جائے مگر اجتماعی اور عملی زندگی کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ سوشل حیثیت

سے ہمارا یہ طرزِ عمل عموماً مضرت رساں ثابت ہوا ہے۔

(۲) عقلی حیثیت سے اولاً تو اس جذبہ کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے، اور اگر اُسے قدرت کا ایک قانون مان لیا جائے کہ اس طرح اجتماعی زندگی میں امن و امان ملتا ہے۔ تو پھر ہمیں یہ غور کرنا پڑے گا کہ کسی خاص معاملہ میں رحم کرنا اجتماعی حیثیت سے کیا نتائج پیدا کریگا؟ اور افادی نقطۂ نظر سے اُسکی کیا شان ہے؟ چنانچہ اگر کسی معاملہ میں اجتماعی حیثیت سے رحم کوئی مضرت لاتا ہے، تو وہ کسی طرح جائز نہیں! اسلئے کہ جہد للبقاء اسی کو کہتے ہیں، اور یہی وہ قانون ہے جس کے تحت میں تمام قوی تر ہستیوں کی بقا ضعیف تر ہستیوں کی فنا میں مضمر ہے! لیکن بعض لوگوں نے اس نازک جذبہ (رحم) کو نہیں سمجھا۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال لیا ہے۔ خصوصاً جب یہ غلط فہمی کسی قوم (اہل ہند) میں عملی حیثیت سے پھیل جاتی ہے، تو اُس کے خیالات بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور اس طرح اسکی شجاعت ختم ہو جاتی ہے۔ اور آخر کار دوسری خونخوار قومیں حملہ آور ہو کر اُسے اپنا محکوم بنا لیتی ہیں! مگر یہ بوسیدہ خیال میں کسی طرح قبول نہیں کر سکتا کہ محض گوشت خوری کا ترک بزدلی کا پاسبان ہے ——— یا گوشت نہ کھانے والی قوم محض اسی عمل کی بنا پر محکوم بن جاتی ہے! ——— اسلئے کہ جو شے محکومیت کی جان ہے، وہ عدم تنظیم ہے ——— اور فقط عدم تنظیم۔ جس کے خلاف صورت میں کوئی قوم کبھی مغلوب نہیں بن سکتی! البتہ میں جس اصول پر گوشت خوری کی تائید کر رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جب گوشت بھی ہماری دیگر غذاؤں میں سے ایک ہے تو پھر بغیر کسی خاص علت کے ہمیں اُسے ترک کر دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

مسئلۂ حلال وحرام

آسمانی مذاہب میں ایک حلال وحرام کا بھی قضیہ ہے۔ جسے اسلامی متکلمین

نے مغالطوں کی مدد سے بہت اہمیت دے رکھی ہے، مگر میری سمجھ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں آتا کہ شاید اسلامی پیدائش سے قبل یہودیوں میں حلال و حرام کا ایک مسئلہ چلا آرہا تھا، جو توریت میں غالباً اس زمانہ کے دیگر قدیم مذہبی روایات سے موثرات زمانہ کے ذریعہ آیا ہوگا۔ اور یہ ایک قدرتی قانون ہے، کہ ہر پسماندہ تمدن اپنے سے اعلیٰ تمدن کی تقلید کرتا ہے۔ چنانچہ اسی موثر نے بانیٔ اسلام کو بھی اپنے سے اعلیٰ پیداوار (یہودیت) کی تقلید پر مجبور کیا۔ اور اس طرح یہ حلال و حرام جانوروں کی تقسیم کورانہ حیثیت سے جزو اسلام بن گئی!

اور یہی وجہ ہے کہ اگر سائنس کے معیار پر اس اصول کو جانچا جاتا ہے۔ تو اس کی حیثیت

له یہ ایک قانون قدرت ہے کہ ہمیشہ ہر ادنیٰ قوم اپنے سے اعلیٰ قوم کی کورانہ تقلید کرتی ہے — جس کی مثال میں آج ہم اپنے ملک کو یورپ کی تقلید کے باب میں پیش کر سکتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر بانیٔ مذہب مثل دیگر رہنماؤں کے اپنے دور ماضی و حال سے استفادہ کرتے رہے۔ اور اسی بنا پر محمدؐ نے یہودیت سے استفادہ کیا۔ چنانچہ اکثر توریت کے مسائل و روایات اپنی اصلی شان میں قرآن میں شامل ہو گئے اور اسلامی تمدن نے بھی بہت کچھ یہودی تمدن کی کورانہ تقلید کی۔ مثال کے طور پر ہم ختنہ اور قربانی کو پیش کر سکتے ہیں — قدیم اقوام قربانی میں خون کو دیوتاؤں کا حق مانتی تھیں، اور انہیں موثرات کے تحت میں ذبیحہ کا طریقہ یہودیوں میں آیا۔ اور پھر توریت سے قرآن میں داخل ہوا۔ بات یہ ہے کہ ہر تمدن میں بہت سی باتیں روایات و رسوم کی شکل میں غیروں کے یہاں سے آجاتی ہیں۔ اور پھر کثرت عمل سے ان کی علت پر کسی کی نظر نہیں جاتی، بلکہ وہ اس تمدن کے مسلمات میں سے بن جاتی ہیں۔

بھی ایک "معمہ" کی رہ جاتی ہے۔ اسلئے کہ بہت سے حلال جانوروں ...... کا گوشت
طبّی اصول پر مضرِ صحت ہے، اسی طرح بہت سے حرام جانور گوشت خوری کیلئے
طبّی اصول پر منفعت بخش بھی ہیں!

اور اگر ہم علم الحیات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو یہ دعویٰ بھی ہم بآسانی کرسکتے ہیں کہ
تمام حیوانات کے ساتھ قانون ارتقاء کے مطابق نفسیاتی و جسمانی انقلاب جاری ہے
چنانچہ کوئی حیوان بھی آج ایسا نہیں جو مثلاً دس ھزار برس کے بعد اپنی نفسیاتی
و جسمانی شکل نہ تبدیل کردے! پھر ہمارا یہ "اصول فقہ" کہاں جائیگا؟ ——
جس کے تحت میں یہ حلال و حرام کا قانون بنایا گیا ہے! مگر اس کا جواب شاید
ہمارے علماء یہی یہ دیں گے کہ بھائی! دنیا میں دہریت اور گمراہی کا سیلاب
آرہا ہے کیا تمہیں یہ یقین نہیں ہے کہ ہمارا یہ مذہب حق اتنے عرصہ تک دنیا
میں ٹھہرے گا؟ اور بھائی ہم تو قیامت کے منتظر بیٹھے ہیں!

بہرحال یہ بحث ایک ماھرِ علم الحیات ہی پورے طور پر لکھ سکتا ہے
ہم اس مقام پر لطیفہ کے طور پر ایک بات اور بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اس سوال کا
جواب "یعنی مرغی اور انڈا دونوں میں سے پہلے کس کا وجود ہوا؟" بھی اسی مسئلہ
کے حل میں مضمر ہے —— نہ تو مرغی پہلے تھی اور نہ انڈا۔ بلکہ یہ حیوانات کے
مختلف نسلی اور جسمانی (مادی) تغیرات کا ایک مظہر ہے —— جسے آج مرغی کہتے ہیں
مناکحت۔

بہت سی بھی جگہ بیان لیا ہے یہاں سے ایک مسئلہ "مناکحت" بھی ہے! میری سمجھ
میں نہیں آتا کہ ان چند مخصوص جملوں (جنہیں ملّا ہمہ وقت اس خاص کام کیلئے
محفوظ رکھتے ہیں) کو دہرا لینے بغیر نظام فطرت کیوں ناقص رہتا ہے؟ شاید
اس کا جواب ہمارا یہ مذہب یہ دیں گے کہ ہر مذہب ایک مستقل تمدن ہے جو

ضروریات زندگی کیلئے اپنے خاص قوانین و احکام بھی لاتا ہے تو ایسی صورت میں میرا جواب یہ ہے کہ جب دور حاضرہ علم و عقل کا پاسبان ہے تو "سول میرج" سے زیادہ آسان، روشن اور ارتقائی صورت اس مسئلہ کی اور کیا ہو سکتی ہے؟

افسوس! اس وہم سے بھی آج انسانی ذہن کے فطری ارتقا کو صدمہ پہنچا دیا ہے اور اسکی قدرتی پرواز کو روک دیا ہے لا

عبادت

عبادت کا مسئلہ بھی اسی قسم کا ایک "وہم" ہے، کیا اللہ والوں کا اپنے معبود کے ساتھ یہی "عقیدہ" ہے کہ وہ اپنے بندہ کے رسم و رواج کا محتاج ہے؟ اور بغیر اپنے بندہ کو رسمی لباس پہنائے ہوئے، وہ اسکی حالت سے آگاہ نہیں ہو سکتا؟ اور کیا بندہ بھی محض خاموش "تفکر و دلی خیال" کے ذریعہ سے اپنے معبود کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا؟ لیکن اسے اگر ایک "رسم" مان لیا جائے، جس کے ذریعہ سے ایک عامی کو عمل کرنے میں آسانی ہوتی ہے تو بھی دور حاضرہ میں ارتقائی قانون کو پیش نظر رکھکر اسمیں ترمیم کرنی چاہیئے تھی، تاکہ ذہن کی فطری پرواز کہیں رک نہ جائے!

مختصر یہ ہے کہ اسی قسم کی بہت سی مذہبی پابندیاں ہیں، جو دماغ کو اپنے فطری "ارتقا" پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، اور اس طرح ایک مذہبی آدمی کی نگاہ میں دنیا ایک "پنچایتی گھروندا" معلوم ہوتی ہے، جسے پہیلیوں کی طرح حل کیا جاتا ہے۔ اور ان بڑے بڑے فلسفیانہ نکات اور گہرے مسائل کو (جنہیں یا تو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ ورنہ انہیں ہاتھ ہی نہ لگایا جائے) مغالطوں کی مدد سے اسقدر ٹھیس لگا دیجاتی ہے، کہ پھر دماغ میں ان کو صحیح روشنی میں سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی! پھر ایسی صورت میں "انسان" بھی فطرت کے بلند اور منتشر لطیف مناظر [illegible] کو دیکھ سکتے ہیں؟ اور علم و عمل کی حقیقی کیفیت

کیونکہ پیدا ہوسکتی ہے ؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب ساری قوم اس وبا میں مبتلا ہو جائے، تو اسکی ارتقاء کہاں تک قدرتی طور پر ہوسکتی ہے ؟

ساتویں فصل

گناہ

گناہ کیا ہے ؟ اس کا جواب چند باتوں کے حل پر مبنی ہے، جن میں سے پہلی شئے مسئلہ "جبر و اختیار" ہے، اور اسلئے ہمارے لئے لازمی ہے کہ پہلے ہم "جبر و اختیار" پر ایک اجمالی بحث کریں۔

جبر و اختیار

انسانی اعمال کو سطحی نگاہ سے دیکھنے والے یہ دعویٰ بآسانی کر دیتے ہیں، کہ انسان خود مختار ہے، اور اپنے نیک و بد افعال کا وہ خود ذمہ دار ہے، لیکن ایک محدود طبقہ، اسرار کائنات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا جس کا شعار ہے! اس راز کو بآسانی پالیتا ہے کہ خوب و زشت ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں! اور جسے ہم "تدبیر" کے نام سے پکارتے ہیں وہ بھی دراصل "تقدیر" کا ایک گم گشتہ نام ہے، اور اسکی ایک نقاب پوش صورت ہے۔ اور انسان کی قسمت تو تاریک ماضی (خاندان) اور پُر اسرار حال (ماحول) کے اندر مخفی ہے! ـــــ بچہ اپنے ماں باپ کے نفسیات، ملکی آب و ہوا اور "تاریخی و تمدنی موثرات" کا مظہر ہوتا ہے ـــــ پھر اپنی عمر کے ساتھ اس پر اسکی تعلیم و تربیت، سوسائٹی اور اس کے بزرگوں کے اقتصادی حالات کا بھی رنگ چڑھتا ہے، اور "منشور" بھی اسے اپنے ہی ماحول

کے اندر آتا ہے۔ جس فضا کا وہ صحیح معنوں میں فرزند ہوتا ہے! —— غرضکہ تولد اور موت دونوں اس کے اختیار میں نہیں۔ اور انسان مجبورِ محض ہے ......!

کیا مسئلہ جبر کیلئے کسی آسمانی طاقت (خدا) کا ماننا ضروری ہے؟

مجھے یہ منطق سمجھ نہیں آتی ہے کہ بعض لوگ محض اس مسئلہ (جبر) سے خدا کے وجود کی ایک دلیل گھڑ لیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی دماغوں میں "خدا" اور "اختیار" یہ دو مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ اسلئے "جبر" کا سہرا بھی وہ اسی کے سر چڑھا دیتے ہیں۔ درانحالیکہ اگر ہم مادہ محض یا "فطرتِ کل" کے قائل ہو جائیں۔ تو مسئلہ جبر پر ہماری دلیل زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے! اسلئے کہ انسان اسی فطرت کا ایک مظہر ہے۔ اور وہ قوانین فطرت پر غیر شاعرانہ اور غیر ارادی طور پر کاربند ہے، ہم یہ کب کہتے ہیں، کہ انسان فطرت کا موجد یا خالق بھی ہے؟

گناہ و ثواب

لہذا عذاب و ثواب کو بھی ہم اس سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے، کہ وہ افعال جو "حیات انسانی" کے لئے کسی نوعیت سے بھی مضرت رساں ہیں، بس اس ایک اعتبار سے اُن پر عمل پیرا ہونا عذاب یا گناہ ہے اور بعینہٖ وہ افعال جو حیات انسانی کیلئے مفاد بخش ہیں۔ اسی ایک حیثیت سے ان پر کاربند ہونا "ثواب" ہے! مثلاً بغیر کسی خاص علت کے زہر کھا لینا "گناہ" ہے اور حالتِ مرض میں دوا استعمال کرنا "ثواب"! —— اسلئے کہ تمام "گناہ و ثواب" کا تعین عملی نتائج کے اعتبار پر ہو سکتا ہے! اور یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام افعال ایسے ہی نکلیں گے جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں مختلف حیثیتیں رکھتے چلے آتے ہیں اور پھر

ایک ہی قوم میں فرصت اور ضرورت کی بنا پر ان افعال کی حیثیتیں بدلتی رہتی ہیں، چنانچہ ہم "عذاب و ثواب" کا کوئی اصلی معیار نہیں بنا سکتے۔ اسلئے کہ ہم مذہبی ذہنیت کی طرح چند آسمانی احکام کو فرض نہیں کرتے اور اس طرح غلط طریقہ پر دل کو تسکین دے لیں!

دنیا میں خوب و زشت کا وجود نہیں۔

چنانچہ کائنات کے متعلق بھی ہمیں کسی قسم کا اچھا یا برا خیال قائم کرنے کا حق نہیں ہے! اسلئے کہ خوب و زشت کا دائرہ زیادہ سے زیادہ انسانی فطرت اور انسانی زندگی تک محدود کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ انسانی دماغ ہے، جسنے اپنے حیاتی مقاصد کو پیش نظر رکھکر اشیاء عالم کو بھی دو حصوں (نیک و بد) میں تقسیم کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر اناج انسانی زندگی میں معین ہے اسلئے مفید ہے اور زہر انسانی زندگی کو فنا کرتا ہے۔ اسلئے مضر ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ اس کا موقع اور استعمال اس کلیہ[۱] کو بھی توڑ دیتا ہے! اور یہ تعینات بھی ہنگامی ملکی اور قومی مذاق کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں! اسلیئے کائنات کی تعریف بجز اسکے اور کیا ہو سکتی ہے، کہ وہ مختلف کیفیات اور تعینات کا ایک مظہر ہے، جہاں ازل و ابد الفاظ بے معنی کی حیثیتیں رکھتے ہیں!

---

[۱] اگر کائنات میں انسان کے ماسوا کوئی دوسری مخلوق نہ ہوتی۔ تو بھی حیات انسانی کو معیار قرار دیکر ہم اشیاء عالم پر نیک و بد کی کلی حیثیت سے تقسیم کر سکتے! مگر لطف تو یہ ہے کہ تمام اشیاء عالم اپنے خصوصیات میں مختلف چلے آتے ہیں۔ بعینہٖ تمام مخلوقات بھی نفسیاتی و جسمانی حیثیت سے مختلف ہیں۔ مثلاً وہ زہریلی بدبودار اور بدذائقہ چیزیں جو حیات انسانی کیلئے پیام مرگ ہیں۔ ان کے اندر بھی ایک قسم کی مخلوق (جراثیم وغیرہ) نشوونما پاتی ہے۔ چنانچہ کائنات میں مخلوقات کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں (۱) وہ مخلوق جو محض ہوائی فضا میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی زندگی اسی فضا تک محدود ہے (۲) وہ مخلوق جو محض زمین کے

آٹھویں فصل

عقلی حیثیت سے پیشوایانِ دینی کا مقام

اگرچہ مذہبی پیشواؤں (مثلاً محمد، عیسیٰ، کرشن اور گوتم وغیرہ) میں بھی ہر ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی! پر خلوص بھی اور خود غرض بھی، لیکن عقیدت نے آج ان سب کی اصلیت کو چھپا دیا ہے۔ اور ان کے جو چہرے آج ہمارے سامنے ہیں، ان کی حقیقت بالکل مختلف تھی!

بات یہ ہے کہ ذہنیتِ عوام کسی معاملہ میں کبھی حدِ اعتدال پر نہیں ٹھہرتی! چنانچہ یہی سلوک ان افراد کے ساتھ بھی اُس کا ہمیشہ رہا ہے ـــــ وہ یا تو کسی ذات کی اپنی نگاہ میں اہمیت ہی نہیں دیتی اور اگر اسکی نگاہ میں کسی ذات کا کوئی مقام ہو گیا۔ تو بس اُسی کا نام "دیوتا" "اوتار" یا "پیغمبر" ہو جاتا ہے! یہ ناممکن امر ہے کہ جماعت کسی شخص کی طرف توجہ کرے اور پھر بھی اُسے "فوق البشر" نہ بنا دے!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) ۲ اندر رہتی ہے، اور اُس نے روشنی دیکھی ہی نہیں (۳)، وہ مخلوق جو محض سطحِ زمین پر رہتی ہے (۴)، وہ مخلوق جو پانی میں رہتی ہے اور اُسے روشنی اور تاریکی دونوں حصوں میں آب سے تعلق ہے (۵) وہ مخلوق جو محض دریا کی تہ میں رہتی ہے (۶)، وہ مخلوق جو محض پانی کی تاریک فضا میں رہتی ہو۔ اور جسے نہ تو سطحِ زمین سے تعلق ہے اور نہ سطحِ آب سے! چنانچہ ان صورتوں میں کوئی مخلوق کیا دوسری مخلوق کا نفسیاتی اور حیاتی علم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہ مخلوق جو مختلف سیاروں میں رہتی ہو اسکے متعلق تو کسی قسم کی بحث بھی محال ہے!

اسلئے ایسی نازک حالت میں جبکہ تمام پیشوایان دینی اپنے چہروں پر نقابیں ڈالے ہوئے ہمارے سامنے فسانوں کے ہیرو بنے کھڑے ہیں۔ تو پھر ہم بھلا کیونکر نہ عقلی نقطۂ نظر سے اُن کے متعلق نیک و بد کسی قسم کی رائے زنی کرنے سے گریز کریں؟ اسلئے کہ اگر ہم ان کے متعلق نیک خیال قائم کرتے ہیں۔ تو یقیناً وہ ذہنیت عوام کا اتباع ہوجائیگا! اور عقلی حیثیت سے ہمارے امکان میں کوئی صحیح وسیلہ اپنی رائے کی تصدیق کا نہیں ہے (جیسا کہ مذکورہ بالا ہے) اور اگر ہم خیال بد قائم کرتے ہیں تو اس امر کے واقعہ سے خلاف ہونے کا اندیشہ ہے ــــ (جس سے اور قسم کے عملی و ذہنی نقصان پہنچینگے) اس لئے کہ ان کی صحیح ذہنیت اور اصلی زندگی ہمارے سامنے نہیں ہے!

دیکھیے! مثلاً علی کو شیعہ۔ محمد کو سُنی اور رام یا کرشن کو ہندو کیسے کیسے فسانوں کا ہیرو بناتے ہیں۔ کبھی تو انہیں آسمان پر لیجاتے ہیں اور کبھی جنوں سے لڑا دیتے ہیں، اور یہی زبوں حالت دیگر رہنمایانِ دینی مثلاً گوتم وغیرہ کی ان کے پیرووں کے ہاتھوں ننگی ہے! اسلئے اگر ہم کو اپنی ذہنیت، توہمات سے پاک رکھنی ہے، تو ان بزرگوں کا دامن ہمیں چھوڑنا پڑے گا!!

نویں فصل

ذہنیت گردوپیش کا اثر کیونکر قبول کرتی ہے؟

موروثی، قومی اور ملکی موثرات ذہن انسانی کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں ــــ اور اگرچہ تربیت کا مرتبہ رسمی تعلیم سے افضل ہے، لیکن یہ موثرات تربیت سے

زائد از رسم نتائج پیدا کرتے ہیں!

چنانچہ ہم اپنی گذشتہ تصنیف "پیام جاوید" کا ایک اقتباس اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کیلئے پیش کرتے ہیں جس میں ہم نے اس نکتہ پر اجمالی بحث کی ہے ۔ کہ مذہب گرد و پیش کے اثر سے دماغ میں کیونکر سرایت کرتے ہیں :۔ اشخاص کے خیالات اکثر اپنے رجحان طبعی کے موافق ہوتے ہیں، ان کے تحقیقات اور بیانات اپنی تعلیم اور دوسروں سے ماخوذ رایوں کے مطابق لیکن ان کے افعال و اطوار تمامتر اپنے رسم و رواج کے مطابق ہوتے ہیں

یہ تھے حکیم بیکن کے الفاظ ۔ اور حقیقتاً یہ وہ کلیہ ہے ۔ جن سے نجات پانا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے!

انسان کے دماغی کیفیات دو حصوں میں بآسانی تقسیم کئے جا سکتے ہیں، اولاً عقل و ادراک والی کیفیت ثانیاً کیفیت مشاعر و احساس ! چنانچہ تحقیق جس قوت کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ وہ اول الذکر کیفیت دماغی ہے جس کے متعلق بیکن کہا گیا ہے کہ یہ وہ قوت ہے جو تعلیم اور دوسروں سے ماخوذ رایوں سے متاثر ہوتی ہے ۔

چنانچہ یہی وجہ ہوتی ہے کہ کوئی محقق جب فضائے تحقیق پر نظر دوڑاتا ہے تو اسے سب سے پہلے ان پردوں کے اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ جنہوں نے آہستہ آہستہ اس کی کیفیت نفسی میں کچھ اسطرح گھر کر لیا ہے کہ اب وہ جزو نفسیات بنکر رہ گئے ہیں!

یہ تمدن کا وہ باریک مسئلہ ہے جس کے موثرات سے آزاد رہنے کا ہمارے پاس کوئی سہل الحصول وسیلہ نہیں ہے ، اور یہی شئے ہماری تحقیق کی راہ میں اصلی رکاوٹ ہے! چنانچہ بڑے سے بڑا فلسفی کیوں نہ ہو! مگر تحقیق کی راہ میں

سب سے پہلے اسکی نظر جس شے کے اوپر پڑتی ہے، وہ کیا ہے؟ اس کا آبائی مذہب، ملکی رسوم و قیود اور ذاتی اطوار ہیں! وہ سب سے پہلے اس شک میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کا دین یا اس کے رسوم وغیرہ ناقص ہیں بھی یا نہیں؟ اس تحقیق کے دوران میں جو اہم ترین شے اس کی ناکامی کا قوی باعث ہوتی ہے، وہ مذکورہ دماغی کیفیات کی ثانی الذکر حالت ہے! یعنی اس کے احساس بھی اس کی قوتِ ادراک کے ساتھ کچھ اسطرح مخلوط ہو جاتے ہیں کہ وہ آہستہ آہستہ ایک وقت میں جزوِ دلیل بنجاتے ہیں۔ اور یہ تمیز کرنا بھی دشوار گزار ہو جاتا ہے، کہ وہ احساس ہیں بھی یا اجزاء دلیل؟

چنانچہ یہی مشکلیں ہماری تحقیق میں سدِّراہ ہو جاتی ہیں۔ اور یہی باعث تھا۔ کہ دماغی حالت میں ہم پلہ ہونے کے باوجود محقق طوسی شیعہ رابندر ناتھ ٹیگور ہند جدید کے مشہور شاعر اور فلسفی ہندو ہیں! یہی اسباب تھے کہ بیکن کے کانوں میں عیسائیت کے نغمے گونجتے رہے اور غزالی کی نظروں میں اسلام کا پھریرا لہرایا گیا ـــ اور یہ وہ موثرات ہیں، جن سے محفوظ رہنا انسان کی طاقتوں سے باہر ہے!

اپنے ماحول ہی سے متاثر ہو جانے کا یہ باعث ہوتا ہے کہ کوئی آزاد خیال ہستی اگر مذہب سے برگشتہ ہو کر دوبارہ مذہب کا دامن پکڑتی ہے، تو اسے انتخاب کے وقت اپنا دیرینہ مذہب مناسب معلوم ہوتا ہے! اور یہی وجہ ہے کہ بڑی سے بڑی روشن خیال عقلیں، جو دنیا کے دیگر معاملات میں نہایت نکتہ رس ثابت ہوتی ہیں۔ مگر مذہبی امور کے حل کرتے ہیں وہ بھی بالکل ناکام رہتی ہیں۔ (جیسا کہ مذکورہ بالا ہے) ـــ وہ روشن اور کھلے ہوئے مغالطے جنہیں مذہب کا شیرازہ کہنا ہے۔ ان پر طرح طرح کی رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ اور انہیں تاویلوں کے ذریعہ سے طرح طرح کا لباس پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جن کی مضرت پہلے سے زائد بڑھ

جاتی ہے۔ اور وہ تمام علم اور ذکاوت جو اس عمل میں صرف ہوتی ہے۔ ضائع جاتی ہے!

غرضکہ جس طرح ملک کی آب و ہوا انسان کے رنگ روپ، قد و قامت اور دماغی حالات میں نہایت طاقت کے ساتھ دخل رکھتی ہے۔ اسی طرح مذہب بھی ماحول کے ذریعہ غیر شعوری حیثیت سے اپنا کام کیئے جاتا ہے اور دماغ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے، اور اگرچہ موثرات قومی کا آہستہ آہستہ موثرات مذہبی پر غالب آنا ضروری ہے۔ پھر بھی قومیت و مذہب کی کشمکش میں ذرا دیر لگتی ہے۔ اور اس وقفہ میں قوم کی روح زخمی ہو جاتی ہے!

ضمیمہ

ہم جملۂ معترضہ کی طرح اس مقام پر ضمیر (Instinct) کی حقیقت بھی کھولے دیتے ہیں۔ اور یہ بتائے دیتے ہیں کہ وہ بھی انہی موروثی اور گردوپیش کے موثرات کا نتیجہ ہے۔ جو دماغ میں ایک غیر شعوری کیفیت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اسلیئے اسکی حقیقت آسانی سے نہیں کھلتی!

دسویں فصل

بدھ مت پر نقد و تبصرہ

تقریباً تین سال کا عرصہ ہوا کہ بدھ مت کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ گوتم نے اپنی شخصیت سے مجھے اسقدر متاثر کر لیا تھا۔ کہ اگر مذہب کی میری نگاہ میں کوئی اہمیت ہوتی۔ تو

میں یقیناً بدھسٹ تھا مگر ہر شئے پر علمی حیثیت سے نقد و تبصرہ کرنا، مدت سے اپنا شعار بن گیا ہے اسلئے گوتم کا مقام میری نگاہ میں ایک بلند آئیڈیل سے زائد نہ ہوا۔

چنانچہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے اب میں اپنا وہ مضمون بلا کسی خاص ترمیم کے پیش نظر کرتا ہوں۔ لیکن ان الفاظ کے ساتھ، کہ گوتم کا فلسفہ زندگی بھی مثل دیگر فلسفیوں کے ہر مقام اور ہر زمانہ میں قابل عمل نہیں! بلکہ وہ ایک لوری ہے جو تھکی ماندی قوم کو ہیجان کے وقت دنیا مفاد بخش ہو لیکن اس روح کا کسی قوم میں مستقل حیثیت سے قیام، اس کے لئے زوال کا پیام لاتا ہے! اور گو وہ یہ آئیڈیل شخصی حیثیت سے قابل مدح ہو لیکن اجتماعی حیثیت سے ہمیشہ مفاد بخش نہیں ہے! بات یہ ہے کہ رحم و ایثار یہ دو ایسے جذبے ہیں جو دلوں کو گرما دیتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ جو بات دل خوش کن ہو، وہ ہمیشہ نتیجہ خیز بھی ہو!

لیکن یقین بھی دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "الہیات" سے مختلف اور متضاد فلسفہ بھی جو قوم میں مسرت، جوش یا روح عمل پیدا کرتا ہو مستقل حیثیت سے فائدہ بخش نہیں ہے۔ بلکہ اسطرح قوم میں توحش پھیل جائیگا اور اسکی علمی و ادبی ترقیوں کا سدباب ہو جائیگا! اسی لئے نیٹشے کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ اس جنگ عظیم کا باعث اسی کا جذبات انگیز فلسفہ بنا تھا۔ البتہ دونوں فلسفوں میں فرق اتنا ہے کہ اول الذکر کمال تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے اور ثانی الذکر آغاز تہذیب و تمدن کی روح!

اگرچہ یہ مضمون میرے خیالات حاضرہ کی ترجمانی نہیں کرتا (جیسا کہ بیان ہو چکا۔) تاہم اس کو پیش کرنے سے مجھے صرف دکھانا ہے۔ کہ جس قدر

بھی مذاہب ابھی تک خصوصاً ایشیا میں رواج پا چکے ہیں، اُن سب میں اگر کوئی مذہب اوہام سے پاک ہے۔ تو وہ بڑی حد تک گوتم کی تعلیم کہی جا سکتی ہے، اور اگرچہ اجتماعی حیثیت سے وہ دورِ حاضرہ میں قابلِ عمل نہیں ہے۔ تاہم مروجہ ہندومت سے کسی طرح کم تر بھی نہیں، چنانچہ ہندومت کے متبعین کے ذریعہ سے اس اعلیٰ مذہب کے خلاف جو کچھ ظہور پذیر ہوا، وہ اس قوم کے انتہائی ادبار کا ثبوت ہے!

"میں عرصہ سے مذہب کے رسم و رواج اور اسکی کورانہ اطاعت سے آزاد تھا میرے خیال میں ایک مذہبی ریفارمر کا کام محض عوام الناس کو اپنی ملکی، قومی اور ہنگامی ضرورت کی معتدل سطح پر لانا ہوتا ہے۔ البتہ دنیا میں دو شخص ایک سے دل و دماغ کے ہونا ناممکنات سے ہے! اسلئے اُن کے اعمال و اقوال کے جادے بھی مختلف ہو جاتے ہیں، لیکن نیک نیتی اور خلوص جس کے بغیر کوئی تبلیغ بلند آہنگی کے ساتھ اشاعت پذیر نہیں ہو سکتی تقریباً سب کا شعار رہا ہے!

لیکن عوام الناس کی ذہنیت بالکل سطحی ہوتی ہے۔ اسلئے ان مذہبی ریفارمرں کو بھی سطحی اور ظاہری علل و اسباب سے ہمیشہ تعلق رہا ہے! اور زیادہ غور و خوض کرنے سے ان علل و اسباب کی بے بضاعتی کا احساس ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ غور و فکر سے کام لینے والے عموماً ان مذہبی قیود سے آزاد رہتے ہیں!

چنانچہ درد یش مجازی، اگرچہ محقق نہیں، مگر غور و فکر کا عاشق ضرور ہے۔ یا کم از کم کورانہ اطاعت سے تا حد نالاں! اور اس قسم کی بھیڑیا دھساں جماعتوں سے گریزاں! مذہبی قیود کی آہنی زنجیروں کو مدت ہوئی عقلی وسائل سے توڑ چکا ہے۔ پھر بھی پیشوایانِ دینی اعام اس سے کہ وہ کسی قوم و ملت کے ہوں اُسکے جائز حقوق کی پردہ پوشی کرنا مذہب عقل کا سب سے بڑا گناہ جانتا ہے!

البتہ ان جائز حقوق کا معیار اس کی نگاہ میں ذرا بلند ہے ، وہ اس قسم کے جائز
حقوق کا قائل نہیں ۔ جو عوام الناس کے دماغ کا فیصلہ ہوتے ہیں ۔ عوام الناس
کی یہ قسم ظریفی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ اپنے پیشواؤں کو عجیب الخلقت بنا دینا اس
کی نگاہ میں اُن کی جائز خدمت اور مناسب معاوضہ ہے ! لیکن شاید اُسے اس کی
خبر نہیں ، کہ اس طرح وہ اپنے رہنماؤں کے حق میں کانٹے بوتی ہے ، اور اُن کے
اصلی چہرے دنیا کے سامنے نہیں پیش کرتی ۔ تاکہ دُنیا اُن سے مستفید ہو سکے اس
لئے کہ اُنکے اصلی چہرے بھی تو عام انسانوں کے چہرے نہیں ہوتے ، وہ تو خود اپنے
ساتھ تقدس اور متانت لیکر آتے ہیں ۔ مگر عوام الناس کے ہاتھوں یہ چہرے کسی
غیر جنس مخلوق کے چہرے بن جاتے ہیں ۔ پھر ظاہر ہے کہ غیر جنس کے ساتھ جائز
رابطۂ اتحاد کون پیدا کر سکتا ہے !

اگرچہ اس قسم کے طرز عمل کا بیشتر حصہ عوام ہی کے دماغ کا کرشمہ ہے مگر ان
ستم ظریفیوں کے ذمہ دار بعض . . . پیشوا بھی ہوتے ہیں ۔ وحی معجزہ اور الہام
وغیرہ کے متعلق ایک روشن ضمیر اور نیک نیت نقاد کیا رائے زنی کیا کر سکتا ہے؟
میرے خیال میں اس قسم کے رہنما محض عوام ہی کیلئے مضرت رساں نہیں ہوتے ۔ بلکہ خود
اپنے لئے بھی مصیبت کا پیام لاتے ہیں ۔ اسمیں شک نہیں کہ وقتی طور پر اس قسم کی شعبدہ
بازی ان کی کامیابی میں سہولتیں پیدا کر دیتی ہے ۔ مگر آخرکار روشن خیال طبقہ کی نظر میں
ان کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی ، اور کمزور ذہنیت والے عوام کو جو کچھ نقصان پہنچ
جاتا ہے وہ بیان سے باہر ہے ! ان کی کمزور ذہنیتوں کو بجائے اصلاح پذیری
کے گمراہی کا سبق ملتا ہے ! لیکن افسوس تو یہ ہے کہ محض عوام ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک
خواص بھی اس خسارہ کے حصہ دار بن جاتے ہیں ۔ اور اُن کا دماغ بھی ضلالت و
گمرہی کے غاروں میں گرتا پڑتا رہتا ہے ۔ اور استدلال کو صحیح راستہ تلاش کرنے

میں صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے!

اس قسم کی سیاست سے کام لینے والوں کی تعداد صفحۂ ہستی پر بہت ہے! لیکن ہندوستان میں جسقدر بھی مروجہ مذاہب آج پائے جاتے ہیں - اُن میں دو اہم ترین مذاہب یعنی ہندومت اور اسلام - ان دونوں میں مجھے استعارہ کی شان بہت نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہندومت میں یہ عنصر اُن کے مقلدین کے دماغ کا نتیجہ ہو۔ اس لئے کہ اُس کے نور رہنماؤں کی صحیح تاریخ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ مگر اسلام (جو اسرائیلی اسکول آف ریلیجن کی ایک شاخ ہے۔) کے متعلق جرأت سے کام لیکر ادب کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے، کہ اس پر سیاست کا رنگ غالب ہے، اور اس پالیسی نے اگرچہ وقتی طور پر بانیانِ اسلام کو کامیاب بنا دیا مگر یہ تمام شان و شوکت ایک محقق کی نگاہ میں ملمع سازی سے زائد حقیقت نہیں رکھتی! اسلام مافوق الطبعی حیثیت سے جو پیام لاتا ہے، میں اس سے بھی اتفاق نہیں کرتا، اسلئے کہ علت و معلول کا وہ آہنی قانون جس نے کمزور دماغوں کو مبتلائے آزار بنا رکھا ہے، اپنے ہی ذہن کی ناقص پیداوار ہے! اور اسی لئے میں اپنی ذات سے متشکک یا لا ادریہ ہوں!

میرے خیال میں محض ذات باری کا عقیدہ ہی اخلاق کی تکمیل کا واحد ذریعہ نہیں ہے، بلکہ خود اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کیلئے بھی انسان کو اخلاق کے تمام حدود طے کرنا لازمی ہو جاتا ہے! ورنہ زندگی میں صحیح امن اور اصلی سکون نصیب نہیں ہو سکتا جس کی تفصیل اس مختصر میں نامناسب ہے، البتہ اپنی جدید تصنیف "پیام جاوید" میں میں نے اس اہم مسئلہ پر ایک اجمالی بحث کی ہے!

لیکن یہاں اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں خود کو اور تمام کائنات کو ایک نگاہ سے دیکھنا، بس اخلاق کی تخم ریزی کیلئے کافی ہے - اور جس کا کمال اس خیال کی تکمیل کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو عملی صورت اختیار کئے بغیر نہ تو رہ سکتا ہے

اور نہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے —— اور اس طرح اپنے فطری قوے کو حصولِ معتدل کا سبق ملتا ہے !

اگرچہ یہ میرا ذاتی ہے ، اور میں اس معاملہ میں کسی کا مقلد نہیں، لیکن پیشوایانِ دینی میں ماسوا گوتم کے اور کوئی شخصیت مجھے نظر نہیں آتی جس کے مقابلہ میں میں اپنی صدا کو آوازِ بازگشت سے تعبیر کر سکوں ! میں جذبات سے نہیں بلکہ عقل سے اُسکی صدا پر لبیک کہتا ہوں !

مذہبی ریفارمر کا جو کچھ بھی آئیڈیل ایک تحقیق پسند دماغ میں سما سکتا ہے میں گوتم کو اُس کا مظہر پاتا ہوں - البتہ دیگر پیشوایانِ دینی اور اُن کے اخلاص کی داد بھی اُن کی حیثیتوں کے مطابق نہ دینا میرے اختیار سے باہر ہے ! (جیسا کہ مذکورہ بالا ہے) میں اُنہیں بھی زیادہ سے زیادہ ذی شعور انسان مان سکتا ہوں - مگر خیالی بُت نہیں بنا سکتا - میں انہیں بھی رحم و کرم کا مجسمہ دیکھ سکتا ہوں - مگر اچھوتی اور ڈراؤنی صورت میں تصور نہیں کر سکتا ! پھر بھی اسقدر اوصاف کا مظہر مجھے کوئی اور نظر نہیں آتا ! —
سنجیدہ —— متین —— رحیم —— نیک دل —— نیک صفات —— نیک خیال سادگی پسند —— سادہ کردار —— سادگی شعار —— !

عُرفی کے اس شعر میں مجھے گوتم کی تصویر نظر آتی ہے ؎

شہنشاہے کہ بست از غایتِ درویشی وہمت
وجودِ خود فراموش و غمِ عالم فراموش

عرصہ سے میں خیام کا پرستار ہوں - مگر محض دماغی اعتبار سے - یعنی ہم دونوں متشکک ہیں - اور تخیل کی بلند پروازی کو بے مقصد جذبات کی ادھیڑ بن جانتے ہیں (اور یہی گوتم کہتا ہے) مگر عملی حیثیت سے میں نے ابھی تک خیام کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا ہے ! اسلئے کہ اسکی رباعیات کے متعلق ابھی تک کوئی قابلِ اعتبار

تحقیقات نہیں ہوئے ہیں ! اور اکثر رباعیات عالم شک میں پڑے ہوئے ہیں !
لیکن گوتم کے یہاں تضادِ خیال مفقود ہے اور اسلئے میں تقریباً دو سال سے اُسکے
جادۂ عمل کو اپنا رہگذر بنائے ہوئے ہوں ! اسی بنا پر گوشت خوری میری نگاہ میں
ایک گناہ نہیں - بلکہ ایک خلافِ انسانیت عمل ہے ! پھر اعتقاد اور عقیدت کی زنجیروں
سے میں آزاد ہوں ، میرے خیال میں ہر بلند آئیڈیل جب اعتقاد اور عقیدت کی شکل
اختیار کرلیتا ہے - تو اس کا مفاد کسی تیسرے درجہ کے آئیڈیل سے بھی زیادہ نتیجہ خیز
ثابت نہیں ہوتا - اور اسوقت تمام مذاہب عالم کے فطری حقوق یکساں ہو جاتے ہیں
اور عوام و خواص میں کوئی خاص ما بہ الامتیاز شئے نہیں رہ جاتی !
یہی وجہ ہے کہ اگرچہ میں گوتم کو تمام پیشواؤں پر ترجیح دیتا ہوں مگر خود کو بدھسٹ
نہیں کہتا - اسلئے کہ فائدہ رساں کسی مذہب کا صرف آئیڈیل ہو سکتا ہے ، نہ کہ اس کا
نام یا ظاہری رسوم و قیود ! میرے خیال کو خود گوتم کی زبانی سنو ! " اگر تمہیں اپنی
زندگی میں نِروان (سکون) حاصل ہو جائے ، تو میری تقلید سے آزاد ہو سکتے ہو "
جس کے تحت میں اس رسم پرستی کی تردید منظور تھی !
چنانچہ میں گوتم کو دنیا کیلئے مفید جانتا ہوں - مگر اس کے اخلاقیات اور فلسفہ
کو ، نہ کہ اس کے ڈراؤنے تخیل کو جو ایک خاص الوہیت کی رنگ آمیزی کے ساتھ
اس کے پیروؤں کی تصنیف ہے !
البتہ اس مذہب میں ایک مسئلہ" تناسخ " میری سمجھ میں نہیں آتا - اور پھر میری سمجھ
میں یہ بھی نہیں آتا ، کہ جو شخص روح و خدا کے اثبات و نفی کا جواب مُہرِ سکوت سے

ـــہ ناظرین نے ایک مقام پر "رحم" کے ضمن میں میرے اس خیال کی تردید پائی ہوگی - چنانچہ
اب میں اپنے اس دیرینہ خیال کو "خیال کی بے اعتدالیوں" میں شمار کرتا ہوں -

دے۔ وہ بھلا تناسخ کا قائل کیونکر ہو سکتا ہے؟ جس کیلئے روح کا ماننا ضروری ہے اور پھر اسکے تحت میں جزا و سزا کا اقرار بھی لازمی ہو! جس کے نتیجہ میں کسی بالاتر طاقت کا فرض کرنا بھی قطعی ہو جاتا ہے! بات یہ ہے کہ کوئی خیال، خواہ وہ اپنی جگہ پر کتنا ہی درست اور مستحکم ہو، جب کسی قوم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تو وہ اپنی طبیعی اور قومی ذہنیت کے سانچہ میں اس خیال کو بھی ڈھال لیتی ہے، اور اسلئے وہ بجائے ایک "فلسفیانہ مسئلہ" کے محض ایک "عقیدہ" بنکر رہ جاتا ہے! مثال کے طور پر جس طرح گوتم کی وفات کے بعد اُسکے مجسّمے بنائے گئے! اُسی طرح اس کے اکثر خیالات بھی قومی رنگ میں رنگ لئے گئے! ورنہ مسئلہ تناسخ کی تردید کیلئے تو گوتم کا وہی پہلا قول کافی ہے، جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ ظاہر ہے، کہ جو شخص اسی زندگی میں نروان حاصل ہو سکنے کا قائل ہو، اسکے ذہن میں مسئلہ تناسخ کی کیا صورت ہو گی؟

بہر حال میرا خیال تو یہی ہے کہ اگر کسی "رہنما" کے آئیڈیل میں کوئی سقم پایا جائے تو اُس سے اسی طرح اختلاف کرنا چاہیئے جس طرح اسکے مفید اجزا سے اتفاق کیا جائے! اسلئے کہ دنیا کا کوئی دماغ نقص سے کامل طور پر پاک نہیں ہو سکتا اور نہ دو شخص بالکل ہم خیال ہو سکتے ہیں!

چنانچہ بیشتر حیثیتوں سے گوتم کی زندگی اور اُس کا فلسفہ قابلِ قدر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عوام اس کے خیالات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسلئے کہ وہ کور دلی اور زود عملی دونوں باتوں کا خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک اُسکے متعلق یہی نزاع چلی آ رہی ہے کہ آیا اُس کے آئیڈیل کو فلسفہ کہا جائے یا مذہب؟ اسلئے کہ اُس میں واجب الوجود کے عقیدہ کی شرکت نہیں، جو رسمی حیثیت سے مذہب کا عنصرِ اعلیٰ ہے!

لیکن گوتم کو خواہ فلسفی کہو یا مذہبی ریفارمر۔ دونوں حیثیتوں سے اس کا مرتبہ بلند ہی

اگر وہ مذہبی پیشواؤں کے مرقع میں رحم و کرم کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ تو حکماء کی فہرست میں بھی اسکے نام کے ساتھ سنجیدہ اور متین کا لقب شامل ہے۔

وہ تو گلزار ہستی میں نغمہ سنجی کرتا ہوا چلا گیا۔ مگر دوسروں کے لئے معرکہ آرائی کا موقع دیگیا ـــــ ان لوگوں کو جو کور نظری سے محض شخصیت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں! اور اسطرح دیگر راہنماؤں کے باہمی موازنہ میں دنیا کو میدان کارزار بنا دیتے ہیں! (۲۵ر نومبر ۱۹۳۱ء)

گیارھویں فصل

کیا بغیر مذہب کے کوئی نظام معاشرت برقرار نہیں رہ سکتا؟

یہ بھی ایک ایسا مغالطہ ہے، جو دماغوں پر مستولی ہو گیا ہے اور حامیان مذہب تو اس معاملہ کی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اشاعت کر کے اُسے اپنی سپر بنائے رہتے ہیں! جس سے اُن کے ذاتی اغراض پورے ہو سکیں!!

بات یہ ہے کہ اس خیال کے علمبردار علم اجتماع سے بھی بے خبر ہیں اور نفسیات مذہب سے بھی! مذہب کیا ہے؟ ایک غیر شعوری قانون! جسکی نشو و نما دماغ انسانی کے تاریک خانوں میں ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے، کہ مذہب اُسی وقت دُنیا میں اشاعت پاتا ہے، جب اقوام غیر شعوری اور تاریکی کے دور سے گذر رہے ہوں! لیکن زمانۂ حاضرہ "علم و عقل کا دور ہے" پھر اس دور میں ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی روش زندگی سے نا مذہب واسطہ ہے، اور آج تمدن و معاشرت، سائنس اور نظام سیاست وغیرہ کو وہی طاقت حاصل ہو گئی ہے۔ جو اگلے زمانہ میں آسمانی دیوتاؤں کو

نصیب تھی! اور اب انسانی زندگی تاریک اور "غیر شعوری" دنیا سے نکلکر روشن عالم شعور" میں آگئی ہے۔ اب انسان نے اپنی زندگی اپنے ہاتھ میں لے لی ہے، اور اس نے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ مذہب درحقیقت ہمارے ہی ذہن ماضی کا ایک پرتو ہے۔ جو خود ہماری "تخلیق" ہے، اور ہم اپنی نادانی سے اتنے عرصے سے جس کے "مخلوق" بنے بیٹھے رہے اور حقیقتاً" یہی وہ راز تھا جس نے ہویدا ہوکر ذہن انسانی میں وہی مقام سائنس اور سیاست و تمدن کو دیدیا۔ جو پہلے دین و مذہب کا حق سمجھا جاتا تھا! چنانچہ ہم جملۂ معترضہ کی طرح یہ بھی بتا ئے دیتے ہیں، کہ ارباب مذہب کا یہ اعتراض، کہ "کوئی شخص جب تک تمام مذاہب کو جانتا نہ ہو۔ یا اپنے مذہب سے واقف نہ ہو جائے، اسے اس کی تردید کا حق حاصل نہیں" غلط ہے اس لئے کہ ہم تو نفسیات مذہب اور اصل مذہب سے بحث کرتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرتے ہیں، کہ کوئی مذہب آسمانی نہیں! سب مذاہب ذہن انسانی کی پیداواریں ہیں! پھر ہم کو کسی مذہب کے اصول و فروع سے کیا واسطہ؟ ممکن ہے کہ بعض مذاہب باہمی موازنہ میں اچھے برے کہے جا سکیں۔ مگر ہم کو ان کی تقلید سے جب غرض ہی نہیں ہے۔ تو پھر اس نتیجہ تک پہنچنے سے کیا حاصل؟ ایسی حالت میں کہ جب ہم اپنی زندگی کا دستور العمل خود بنا سکتے ہیں! اور اب وہ زمانہ آگیا ہے، کہ خدا کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی ہے، اور اب بجائے الہامی کتب ـــ (جو ذہن انسانی کے غیر شعوری حصہ کی پیداواریں تھیں) کے پڑھے جانے کے حکما اور فلاسفہ کی تصانیف زیادہ لطف کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ جن کی روح بیدار دنیا سے تعلق رکھتی ہے، اور جو دماغ کو فطری راستوں میں ترقی کرنے کی ہدایت کرتی ہیں!

ہم لطیفہ کے طور پر اس مقام پر یہ راز بھی کھولے دیتے ہیں۔ کہ عموماً

مذہبی آدمیوں کے مقابلہ میں غیر مذہبی اور عقلی آدمی جو زیادہ خلیق اور ذمہ دار انسان ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا باعث بھی یہی ہے۔ کہ مذہبی ذہنیت بے شعوری اور تاریک فضا میں نشوونما پانے کی بنا پر مردہ رہتی ہے، پھر اس میں بلند حوصلگی، اعلیٰ ظرفی اور اقدام وارادہ کے اعلیٰ صفات انسانی کیونکر جلوہ گر ہو سکتے ہیں؟

؎ چنانچہ یہ قانون تمام مذاہب عالم کے ساتھ جاری ہے۔ مثال کے طور پر کیا ایران میں بھی اسلام ہے جو عرب میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ
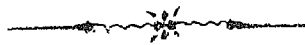
دوسری کتاب

خواص یا لیڈروں کی خصوصیات

باب اوّل

عوام الناس میں ہر فرد اپنے ماحول کا فرزند ہوتا ہے، لیکن ہر ملک و قوم میں
بعض ہستیاں ایسی بھی پائی جاتی ہیں۔ جو اپنے گردوپیش کے اثر کو قبول کرنے کے
بجائے ان سے آمادہ جنگ ہوتی ہیں! اسلئے ہم خواص و عوام میں مابین الامتیاز
خصوصیت یہ پیدا کر سکتے ہیں کہ جس طرح طبقۂ عوام کی ہر فرد کو اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں
میں اپنی قوم و ملت کا ایک "زندہ نمونہ" ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اول الذکر صنف کے
لئے یہ لازمی ہے، کہ وہ ان موثرات سے آزاد ہو اور جسقدر کسی فرد میں یہ تقلیدی
مادہ کم پایا جائیگا۔ اتنا ہی اپنے طبقہ میں اس کا مرتبہ بلند تر ہوتا جائیگا!

چنانچہ ان افراد کی ذہنیت کا نمایاں وصف بجائے "تقلید" کے "اجتہاد" ہوتا ہے
یعنی وہ اپنی قوم و ملت کی ہر شئے کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں!

پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ دماغی اور جسمانی دونوں اعتبار سے یہ لوگ عوام
سے بہتر ہوں۔ بلکہ عموماً ان کا نمایاں کیرکٹر ان کی زبردست قوت ارادی ہوتی ہے
البتہ دیگر حیثیتوں میں بھی یہ لوگ عوام سے ممتاز ہو سکتے ہیں۔ مگر بسا اوقات

یہ فضیلت فطرت کی طرف سے ان کے حصہ میں آتی ہو، یعنی ایک "جینیئس" کی تعریف یہ ہی ہو، کہ بجائے کتابی علم کے اکتساب کے وہ فطرت کا شاگرد ہو۔ اور اسکی خاص قسم کی ذہنیت کو "کتاب کائنات" کا مطالعہ روشن کردے!

پھر طبقہ خواص کے بھی اقسام ہیں: مثلاً - فلاسفر، بانیان مذاہب اور پولیٹیکل لیڈر وغیرہ - جن میں اول الذکر طبقہ کا مقام اصناف خواص میں نہایت بلند ہے ان افراد کے خصائص ان کی انتہا تا درخیالی اور بے انتہا رفعت ذہنی ہے! یہ لوگ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے استغراق میں مشغول رہتے ہیں - جن کی دماغی پیداوار اکثر ناقابل عمل اور بسا اوقات خیالی تک بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے - مگر یہی وہ خیالی فضا ہے جو قوم و ملک کی ذہنیت کو پرواز کی راہ بتاتی ہے - اور دماغوں میں ایک رفعت، ایک اولوالعزمی پیدا کرتی رہتی ہے! یہ لوگ درجہ اول کے خواص یا لیڈر کہلاتے ہیں - اسلئے کہ جیسا کہ بیان ہوچکا، یہی وہ لوگ ہیں جو اقوام کو ذہنی رفعت کا سبق دیتے ہیں - اور ان کا "تفکر" زمان و مکان کی قید سے بڑی حد تک آزاد ہوتا ہے - اسلئے یہی وہ ہستیاں ہیں - جن کی آواز تمام دنیا کی آواز ہوتی ہے - اور اسطرح یہ ہستیاں دنیا کے تمام اقوام و ممالک کو مسخر کرجاتی ہیں! یہی افراد زندۂ جاوید کہے جانے کے حقیقی طور پر مستحق ہیں - اور انہیں کسی خاص ملک و قوم سے منسوب کردینا غلطی ہے!

کافر

یہی گروہ اپنی زندگی میں اپنی قوم و ملک سے "کافر" کا لقب پاتا ہے - مگر ظاہر ہے کہ ہر قوم کا مزاج عقلی بدلتا رہتا ہے - اسلئے جب دنیا ارتقا کی اس منزل پر پہنچتی ہے - جہاں انکی آواز گونج رہی ہوتی ہے - تو ان کی یہی "بدنامی" زمانہ میں "نیک نامی" کا قالب اختیار کرتی ہے، اور آخر کار دنیا یہ دیکھ لیتی ہے کہ ہر قوم و ملک کو اس قسم کے

"کافروں" کی کس قدر احتیاج ہے! اسلئے کہ در اصل انہی کافروں کے وجود سے ارتقاءِ قومی کا وجود ہے، اسلئے جو قوم اس قسم کے "کافر" جس قدر زیادہ پیدا کرے وہ اسی قدر زیادہ "فکر" پیدا کرتی ہے۔

بانیان مذاہب۔

لیڈر یا خواص کی دوسری صنف میں "بانیان مذاہب" آتے ہیں۔ ان افراد کا کام یہ ہے، کہ وہ اپنی قوم کی غلط اعمالی سے متاثر ہو کر ایک جادۂ عمل بناتے ہیں جس کا اساس تمام تر ہنگامی، قومی اور ملکی موثرات پر ہوتا ہے! خیال رہے کہ کوئی سوسائٹی بغیر ایک مذہب یا دماغی تنظیم کے زندہ نہیں رہ سکتی! اس لئے اس طبقہ رہنمایان کا نام سب سے زیادہ روشن اور پیش پیش رہتا ہے۔ پھر اس طبقہ کے لئے لازمی ہیں جو ان افراد کے ذاتی خلوص، ایثار اور قوت ارادی کے لحاظ سے بنائے جا سکتے ہیں مگر ان میں سے وہ تمام افراد جنہوں نے اپنے دور میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا۔ کسی حد تک ان خصوصیات کے مالک ضرور ہوتے ہیں۔ البتہ اگر ہم منطقی حیثیت سے ان کی تحدید کرنا چاہیں تو حسب ذیل طریقہ پر ہو سکتی ہے:-

(۱) وہ مذہبی پیشوا جو محض دنیا کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اپنے لئے کسی قسم کا معاوضہ طلب نہیں کرتے —— اور ان کا ریفارم خواہ اصولی حیثیت سے قابل بحث ہو، مگر وہ کسی قسم کے توہمات کا پاسبان نہیں ہوتا — جس کی شاندار مثال میں گوتم بدھ کو پیش کیا جا سکتا ہے — اس لئے کہ اسکی تبلیغ کسی حق یا معجزہ کی رہین منت نہیں ہے۔ اور یہ اعلیٰ درجہ کی پیشوائی ہے!

(۲) وہ قائدین جو اگرچہ دنیا کے لئے مفاد بخش ہو سکتے ہیں، مگر کسی قدر اُن کی تبلیغ ذہنی ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ بھی ہوتی ہے۔ اور اس میں ان کے نفسانی خواہشات (جاہ و منزلت) بھی شریک ہوتے ہیں —— یہ مبلغین کی دوسری

صنف ہے!

(۳) لیکن تبلیغ کی ایک قسم یہ بھی ہے جس کا مقصد محض اپنی شخصیت اور اپنا اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے — اور اس زمرہ کے قائدین میں صحیح طور پر مرزا غلام احمد قادیانی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے — جو اپنی شخصیت بھی پیدا کر گئے۔ اور دنیا میں کچھ توہمات بڑھا گئے!

سیاسی لیڈر

پھر ان کے بعد تیسری صنف پولیٹیکل لیڈروں کی آتی ہے، جو اگرچہ طبقۂ خواص میں عام طور پر تیسرا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض افراد اپنے دماغی اور شخصی اعتبار پر طبقۂ دوم کی صنف میں پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے زمانہ میں مہاتما گاندھی! لیکن ان قائدین کو ہر حالت میں اپنے موجودہ زمانہ اور موجودہ زندگی سے واسطہ رہتا ہے۔ اور یہ صحیح معنوں میں ملک و قوم کے ہنگامی ضروریات کے ترجمان اور دردِ قومی کی آواز ہوتے ہیں!

ادبا و شعراء

لیکن قائدین کی ایک چوتھی صنف بھی آتی ہے جس میں ادبا و شعرا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر نہایت معمولی ذہنیت کے ہوتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں اپنی قوم کے موجودہ نفسیات کے پرتو اور اسکی آواز ہوتے ہیں۔ اسلئے اگر وہ زندہ قوم کے وارث ہوئے، تو ان کا لٹریچر بھی زندہ اور کارآمد ہوتا ہے۔ ورنہ بے مقصد جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں ...... جو دورِ حاضر کی حالت ہے!

البتہ اس طبقہ میں بھی بعض افراد جداگانہ قسم کی روح لاتے ہیں! مثلاً فلسفیانہ سیاسی اور معاشرتی وغیرہ — لیکن اس روح کو لٹریچر سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک علیحدہ شے ہے۔ مثال کے طور پہ اگر غالب کے کلام میں

فلسفہ ہوتا ہے تو وہ شاعر بھی ہے اور فلسفی بھی! بعینہٖ اقبال شاعر بھی ہیں اور ٹی لیسٹ بھی!
یعنی ان چیزوں کو براہ راست لٹریچر سے تعلق نہیں ہے۔ (جیسا کہ بیان ہو چکا) اور جس
شاعر یا ادیب میں یہ خصوصیت پائی جائے وہ محض شاعر یا ادیب نہیں ہے بلکہ
اس طبقہ سے بلند تر ہستی ہے!

بہر حال یہ خواص یا رہنما اگرچہ ہر قوم و ملت میں تعداد کے لحاظ سے بہت ہوتے
ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں ان کی اصلی تعداد انگلیوں پر گننے کی ہوتی ہے۔
مگر وہ چند قائدین جو صحیح معنوں میں اس معیار پر پورے اتریں۔ اپنے زمانہ کی شبِ تار
کی روشنی ہوتے ہیں۔ اور اپنے تمدن کا حقیقی سرمایہ!
قوم اُن کی نگاہ میں ایک بچہ ہوتی ہے۔ اور وہ اُسے ہنستا دیکھکر خوش ہوتے
ہیں۔ اور روتا دیکھکر مغموم ؎

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
(غالب)

جیسا کہ بیان ہو چکا، زبردست قوتِ ارادی ان کی روح اور ایثار ان کا جوہر ہوتا
ہے، وہ ہمیشہ اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ جس کا نام "انقلاب" ہے
گویا انقلابِ زمانہ ان لوگوں کا کھیل ہوتا ہے۔ اور ان کے دماغ کی ادنیٰ کرشمہ سازی!
اگرچہ زمانہ ان کی کاوشوں کی داد ہمیشہ ظلم و ستم سے دیتا ہے، مگر وہ بجائے
اس برے برتاؤ کا بدلہ لینے کے، ہمیشہ لطف کے ساتھ ان کا سامنا کرتے ہیں!
اور "قوم" کو برابر "جادۂ ارتقا" پر قدم زن کرتے رہتے ہیں۔
یہاں تک کہ آخر کار زمانہ یہ دیکھ لیتا ہے۔ کہ یہی وہ "باغی" ہیں۔ جو آئندہ ترقی کی

درمیانی کڑیاں ہیں، اور انہی "کافروں" کے دم سے "ایمان" کی سلامتی ہے ــــ حقیقۃً ایمان ان ہی کافروں کے سایہ میں پرورش پاتا ہے!

یہی وہ "شہنشاہ" ہیں جو "فقیروں" کے بھیس میں "صدا" لگا جاتے ہیں۔ جو ایک عرصہ تک فضا میں گونجتی رہتی ہے اور عموماً ان کے دورِ اقامت میں کوئی ان کی آواز کی طرف توجہ نہیں کرتا! مگر جب ان کا کوچ ہو جاتا ہے۔ تو یہی "صدا" دوسروں کی روحوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت دُنیا فضول ان کی تلاش میں نکلتی ہے!

باب دوم

شخصیت

دوسروں کی توجہ کو جو شئے اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ وہ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ "روح" ہوتی ہے ــــ یا جیسے زیادہ واضح طور پر یہ کہنا چاہیئے کہ وہ محض زبردست خطبے یا دقیق الفہم کتابیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ اعلیٰ شخصیتیں ہوتی ہیں! چنانچہ ہمیشہ ان کتابوں اور خطبوں کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ان کے مصنفین کی شخصیتوں سے لگایا جاتا ہے! بات یہ ہے کہ جب انسان بعض خیالات کو اپنے ذہن میں خوب پکا لیتا ہے، تو وہ اپنی اس روح (جو اس تفکر نے اس میں پیدا کر دی ہے) کو دوسروں کے قالب میں بھی ڈال دینے پر قادر ہو جاتا ہے، اور یہی خصوصیت ہر اُس لیڈر کی ملک ہوتی ہے جس نے دنیا میں صحیح معنوں میں کوئی "انقلاب" برپا کیا ہے مثلاً محمد، گوتم، نانک اور عیسیٰ وغیرہ، جو گویا اپنی خاص قسم کی مستقل اور جداگانہ دنیا رکھتے تھے، جن کی طاقتیں ساری قوم کی مجموعی روح سے بھی زیادہ زبردست تھیں یہی وجہ تھی کہ ان افراد نے اپنی قوموں کی روحوں کو اپنی روح سے کام لیکر بدل دیا!

باب سوم

مُردہ شخصیتیں ہندوستان میں قبریں حکومت کر رہی ہیں!

گذشتہ بیانات زندہ شخصیتوں کے متعلق تھے؛ لیکن ہر قوم میں بعض مُردہ شخصیتوں کا بھی کم و بیش عملدرآمد ہوتا ہے! اور جب کسی قوم کی روح مردہ ہوجاتی ہے تو اسوقت ان مردہ شخصیتوں کی طاقت کو استحکام حاصل ہوجاتا ہے۔ ان مردہ شخصیتوں میں اگرچہ قومی رسوم و روایات وغیرہ بھی آتے ہیں، مگر ان کی مثال میں ہمارے زمانہ میں خاص طور پر "قبور" کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو صحیح معنوں میں آج ہمارے ملک پر حکومت کر رہی ہیں! اور جو اوہام پرستی اور ادبار قومی کی آخری حد ہے!

اگرچہ یہ عطیہ بھی ہمیں "مذہب" سے ملا ہے، اسلئے کہ موجودہ مروجہ مذاہب میں شریک ہو کر انسان کی عقل و شعور بے حد وہم ہوجاتی ہے۔ اور ذہنوں پر "توہمات" کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بعض ایسے افراد جو خود کو مذہبی ارکان ثابت کرتے ہیں۔ اور اپنی چالاکیوں یا پاکبازیوں سے دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں، جن کے پس مرگ

لہ اسلئے کہ ان افراد میں بھی دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں بعض تو صحیح معنوں میں "فقر" اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جن کا دنیا والوں سے کوئی خود غرضی کا تعلق نہیں ہوتا۔ اور اگر تبلیغ کے معاملہ میں شخصیت کوئی شئے ہے، تو یقیناً یہ لوگ "کنج عزلت" ہی میں اپنی شخصیت سے کام لے کر عوام الناس کی حالت درست کرتے ہیں جن کا عقلی حیثیت سے خواہ کوئی مقام ہو مگر مذہبی حیثیت سے وہ یقیناً قابل داد ہیں۔ مگر ان درویشوں کی کثیر تعداد تو محض رنگا ہوا لباس پہنکر

رسمی طور پر ذہنی عقیدت عوام کو ان کی قبروں کے ساتھ ہو جاتی ہے ——— اور پیری مریدی کی رسم اس عقیدت کو مستحکم کر دیتی ہے، درانحالیکہ اس عقیدت کے جراثیم بھی وہی ہیں جو بُت پرستی کے کام آتے ہیں - اور جو آغاز تمدن کی انسانی ذہنیت کا بچا کھچا اثر ہے! جو ابھی تک دماغوں میں عمل توارث کے ذریعہ چلا آتا ہے! مگر افسوس! اسطرح "خود اعتمادی" کا جذبہ وہ قوم کھو بیٹھتی ہے جس کی یہ ذہنیت ہو جائے!

اقتصادی نقصان

اگر اس قبر پرستی کا نقصان صرف دماغ ہی تک محدود ہوتا - تو وہ بھی نہایت اہمیت رکھتا تھا - مگر غضب تو یہ ہے کہ اس کے پردہ میں ایک عظیم الشان اقتصادی نقصان بھی قوم کو اٹھانا پڑتا ہے، اور وہ کثیر رقم جو مزاروں پر چڑھا دی جاتی ہے، اور جس کی مقدار ہر سال ملک میں کروڑوں (لاکھوں) سے تجاوز کر جاتی ہے، اگرچہ قوم ہی میں رہتی ہے - یعنی مجاوروں اور سجادہ نشینوں کے پیٹ میں جاتی ہے، مگر اس کا جائز مصرف فوت ہو جاتا ہے، اور اس طرح ان سجادہ نشینوں کی جن کی تعریف خیام یوں کرتا ہے[۵]

درکسوتِ خاص آمدہ از علمے چند ❊ بہ نام کنندۂ نکو نامے چند!

ہمت عصیاں اور بڑھا دیجاتی ہے! جب ان بوالہوسوں کا پیٹ اس رقم سے بھی نہیں بھرتا ہے، تو وہ طرح طرح کی دوسری مدیں آمدنی کی کھول دیتے ہیں!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵) ۴ شمس تبریزی بننے کی آرزو کرتی ہے، یہ زمرہ دنیا والوں کی خاطر دعائیں وغیرہ بھی کرتا ہے - جن باتوں کا مقصد بجز زرپرستی کے اور کچھ نہیں! اور اگرچہ یہ ثانی الذکر افراد ملک کیلئے انتہائی خطرناک بھی ہیں - مگر میں تو یہ کہوں گا کہ دونوں قسم کے گروہ تمدن ہند کے نقص کی دلیل ہیں - جو کسی کامل تمدن میں نشوونما نہیں پا سکتے - علاوہ اسطرح ملک کے "جذبۂ خود اعتمادی" کو ٹھیس لگتی ہے! ——— ان درویشوں میں کثیر تعداد سیاسی اشخاص کی گذری ہے!

یعنی یہ شاہانہ بھیس میں ڈاکو، غریب ذہنیت والوں سے نذرلے لیتے ہیں۔ اور زرپرستی کو یہاں بھی قرار نہیں ـــــ اسلئے وہ "دعا" کی بھی ایک دفعہ وضع کر لیتے ہیں (گویا دعا کی تجارت کرتے ہیں!) جس قانون کے تحت ہیں وہ دنیا والوں کے مقاصد کی خاطر اپنے لمبے لمبے ہاتھ دعاؤں کے لئے اٹھاتے ہیں۔ جن ہاتھوں میں روپیہ برسنے لگتا ہے!

کاش! یہ کثیر رقم جو ان پُر فریب اشخاص کے تعیّش کا سامان بنتی ہے۔ اس سے کوئی مفید کام انجام دیا جاتا اور ملک میں بعض صنعت و حرفت کے مدرسے کھولے جاتے، جن کے ذریعہ سے غریبوں کو مفت تعلیم دیجاتی اور اس طرح قوم کے ادبار میں کچھ کمی ہوتی!

لیکن ہمیں جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ان مالی نقصانات اور ان اوہام کی اشاعت کی ذمہ داری محض قبر پرستی تک محدود نہیں، بلکہ شیعول نے بھی "تعزیہ پرستی" کی بنا ڈالکر (جو اس کے جواب میں ہے) اس بدنصیبی میں کافی اضافہ کر دیا ہے، بلکہ اس سے کچھ زیادہ انہوں نے توان اوہام میں گریہ وزاری کا بھی اضافہ کر لیا ہے، جو مستقل حیثیت سے قوم کی شجاعت اور قوتِ عمل کو زائل کرتی رہتی ہے۔ اور اگرچہ بعض موقعوں پر اس قسم کا پروپیگنڈا مظلوم قوموں کی شمشیر فتحمندی رہا ہے۔ مگر وقت نکل جانے کے بعد اس کا قیام لبا اوقات اپنے ہی لئے مضرت رساں ثابت ہوا ہے!

باب چہارم

مولوی اور پنڈت وغیرہ

افسوس ہم اپنے مقصد سے کافی آگے بڑھ گئے۔ ابھی تو ہم اِن مذہبی قائدین کی ایک

شاندار صنف ہمارے بیان سے رہ گئی ہے! جسے چوتھی صنف کہنا چاہیئے۔ اور اس صنف کے اندر کون لوگ آتے ہیں؟ علمائے دین: مولوی اور پنڈت وغیرہ! دراصل یہی وہ قائدین ہوتے ہیں، جن کا فریب انکی رفتار، گفتار، صورت اور لباس سے نمایاں ہوتا ہے! یہ لوگ بجائے اختراع و ایجاد کی صلاحیت رکھنے کے تقلید کے پتلے ہوتے ہیں، اور ان کی تقلید بھی بالکل کورانہ ہوتی ہے، جو انہیں وقت اور ضرورت کے نشیب و فراز کا احساس نہیں ہونے دیتی!

یہ لوگ کسی قسم کے اعلیٰ اخلاق نہیں رکھتے، بلکہ قوم کو ہمیشہ بوسیدہ اور ناقابل عمل جادۂ اخلاق پر ہانکنا چاہتے ہیں ـــــ محض اس لئے کہ اسطرح ان کی شکم پری کا سامان مہیا ہوتا ہے!

اور حقیقتہً یہی وہ گروہ ہے، جس کے ہاتھ سے قوم کے روشن خیال اور سچے رہنماؤں کو ہر زمانہ میں طرح طرح کے صدمے پہنچتے رہتے ہیں!

افکار و تجارب

نوٹ:- میرے روشن خیال ناظرین جنہیں میرے مذہب "عقلیت" نے کچھ اپیل کیا ہے۔ ان کی ضیافت طبع کیلئے میں اپنے بعض مقولہ جات بھی پیش کرتا ہوں:—

(۱) ایک ذی شعور انسان (محقق سکالا دفی الفکر) ایک غیر ذی شعور انسان (مذہبی آدمی) کی زندگی بھر کی عبادت سے افضل ہے۔

(۲) مذاہب کے مختلف اصناف ہیں۔ بعض مذاہب تو اپنے مولد ہی میں زندگی کے دن پورے کر لیتے ہیں۔ جو گویا "پیدائشی مردے" ہیں۔ لیکن بعض مذاہب امراض متعدیہ میں سے ہیں۔ جو پھیلنے کی بہت صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ تمام پر ایک زمانہ کیلئے چھا جاتے ہیں!

(۳) دنیا میں شناسائی کے ساتھ میری ایوسی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور اب "کیرکٹر" مجھے ایک لفظ بے معنیٰ نظر آتا ہے! میں سمجھ رہا ہوں۔ کہ ہر شخص کی ایک قیمت ہے اسکو اس قیمت پر جب چاہو خرید لو!

(۴) مجھے بہ نسبت ذی شعور اشخاص کے بچوں سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ اسلئے کہ اول الذکر صنف میں ہم مذاق کی تلاش بہت مشکل ہے۔ اور ثانی الذکر صنف کو مذاق سے تعلق ہی نہیں —— ان میں سب ہی ایک مستقل اور خاص قسم کا لطف رکھتے ہیں!

(۵) اگر کسی قوم کی ذہنی اور علمی حیثیت کا اندازہ لگانا ہو تو اسکے رسوم پر نظر کرو!

(۶) ہندوستان میں ایک پشت تو روپیہ کماتی اور جمع کرتی ہے۔ دوسری پشت اُسے اپنے صحیح مصرف میں لاتی ہے۔ لیکن تیسری پشت اُسے اُڑا دیتی ہے — یہ ہی ہمارے ملک کی اقتصادی تاریخ !

(۷) رہبانیت کے ابطال میں اس سے بڑی اور کونسی دلیل ہوسکتی ہے؟ کہ دنیا جس قدر پرانی ہوتی جاتی ہے، روزمرہ انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے — یہاں تک کہ ایک روز تمام صحرا بھی آباد نظر آئیں گے !

(۸) کوئی مذہب خواہ اچھا ہو یا بُرا۔ لیکن قومیت ہمیشہ اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے، اسلئے نیک و بد مذاہب کے نتائج قومی حیثیت سے بہت کم اہمیت رکھتے ہیں !

(۹) "رہنمایانِ عالم" کی مثال مرغانِ چمن کی سی ہے کہ وہ اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ جاتے ہیں، اور دُنیا ہمیشہ اُن کے مواد میں لڑتی جھگڑتی رہتی ہے !

(۱۰) دوسروں کے ساتھ احسان کرنا اچھا ہے، لیکن اُن سے اس کے بدلہ کی توقع رکھنا نادانی !

(۱۱) غیروں کے مقابلہ میں عموماً اعزا زیادہ مضرت رساں ثابت ہوتے ہیں، اسلئے کہ زندگی ایک دوامی کشمکش (جہد للبقا) کا نام ہے — اور اعزا کے ساتھ وہ رشتہ قریب تر ہوتا ہے !

(۱۲) مجھے تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دنیا پر رحم یا ہمدردی حکومت نہیں کرتی۔ بلکہ "طاقت" کی حکمرانی ہوتی ہے !

(۱۳) پہلے اپنے نفس پر حکومت کرنا سیکھو۔ پھر دوسرے خود تمہارے محکوم بن جائینگے !

(۱۴) صاحبِ کمال کے زوال کا آغاز اپنے کمال سے لذت اندوز ہونے لگتا ہے

(۱۵) وہ شخص قابلِ تاسف ہے، جو حالت ناکامی میں غفلت کرے، لیکن وہ شخص

سخت خطرناک ہے۔ جو اپنی ناکامیوں کا الزام دوسروں کے سر لگا دے!

(١٦) دنیا میں کوئی خیال اور کوئی طرزِ ادا جدید یا نادر نہیں ہے۔ البتہ پُرخلوص اور صداقت آمیز دل سے اس کا اخراج اُسے نیا بنا دیتا ہے!

(١٧) کردار کے معاملہ میں بجائے دنیا سے خراجِ تحسین کی خواہش رکھنے کے انسان کو حسنِ عمل کی زیادہ پروا کرنی چاہیئے۔ اسلئے کہ ممکن ہے زمانہ کا مذاق ہی خراب ہو۔ اور اسلئے اشتیاقِ تحسین اُسے گمراہی کی طرف متوجہ کر دے!

(١٨) اس میں شک نہیں کہ کسی کی عزت اور شہرت کو محض بدنفسی یا حسد سے صدمہ پہنچانا ایک شدید جرم ہے۔ مگر علمی حیثیت سے نیک نیتی کے ساتھ دوسروں کے عیوب ظاہر کرنے کا بھی ہمیں اتنا ہی حق ہے جسقدر کہ دوسروں کی نیکیوں کے اظہار کا! ورنہ اسطرح تو ہماری تنگ نظری علمِ تاریخ کو بھی ایک گناہِ عظیم قرار دے گی!

فہرست مضامین

طباعتِ کتاب کے بعد چند جُملے

تجدیدِ عمل

تیسری کتاب

قومیات

قومیّت کا ایک جدید تخیّل

تجدیدِ عمل کا یہ جزو در اصل اس کتاب کی اصلی رُوح ہے ــــ جسے بعض اسباب کی بناپر اس اشاعت میں شامل نہیں جاسکا! لیکن ناظرین کی توجہ کا اندازہ لگانے کے بعد یہ جزو بھی ایک مستقل اور مختصر کتاب کی صورت میں بہت جلد شائع کردیا جائیگا!

قیمت ۶ر

(نوٹ) اس اڈیشن میں کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، جنہیں اُمید ہی، کہ ہمارے روشن خیال ناظرین ذرا سی توجہ سے کام لیکر خود سمجھ لینگے ــــ اسلئے غلط نامہ غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

(مصنّف)